وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر: ۲۳ شمارہ نمبر: ۱۱ ذوالقعدہ: ۱۴۴۷ھ مئی ۲۰۲۶ء

بیاد

شمس العلماء

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام

حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین

حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین

حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم

سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم

ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 27-6514525-6514526-061 فیکس نمبر 061-6539485

Email:wifaqulmadaris@gmail.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقراء اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی لوہر گیٹ ملتان

شائع کردہ: مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

ایران اور امریکہ کے درمیان حالیہ جنگ	کلمۃ المدیر	۳
احسان اور تصوف	شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ	۵
تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں (۱)	شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ	۱۱
عمل تدریس میں استاد کا کردار	مولانا زاہد الراشدی	۲۴
شعبہ تحفیظ مضبوط کرنے کے چند آزمودہ طریقے	ابن الحقانی	۳۴
تشہد میں حلقہ بنا کر انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کا ثبوت	مفتی ابوالخیر عارف محمود گلگتی	۳۶
عائلی قوانین اور ہماری عدالتیں	جناب محمد مشتاق احمد پارسنگ	۴۱
حضرت شیخ احمد شناوی رحمہ اللہ تعالیٰ	مولانا جنید اشفاق اٹکی	۴۴
''معتد بہ کلامِ مقدّس'' نامی کتاب؛ ایک جائزہ	مولانا مفتی سمیع الرحمٰن	۵۶
مطالعہ کی میز سے	محمد احمد حافظ	۶۰

﴿مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں﴾

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

ایران اور امریکہ کے درمیان حالیہ جنگ

اور قیامِ امن کے لیے پاکستان کا مخلصانہ کردار

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

یہ سطور تحریر کرتے وقت مشرقِ وسطیٰ کا خطہ جنگ، بارود، جنگ بندی، مذاکرات اور بے اعتمادی کی کیفیات سے گزر رہا ہے۔ دنیا کی آدھی آبادی آبنائے ہرمز کی بندش کے سبب شدید گھٹن اور بے یقینی کی کیفیات کی شکار ہے۔

یہ جنگ نہ صرف مشرقِ وسطیٰ بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک کڑا امتحان بن کر ابھری ہے۔ فروری میں شروع ہونے والے ایران امریکہ تصادم نے عالمی سیاست اور معیشت میں ایک نیا بھونچال پیدا کیا ہے۔ یہ جنگ محض دو ممالک کے درمیان طاقت کی کشمکش نہیں ہے، بلکہ اس نے پوری دنیا کو عموماً اور عالمِ اسلام کو خصوصاً ایک ایسے نازک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں اسے اپنے اسٹریٹجک مفادات، مذہبی وابستگیوں اور علاقائی امن کے درمیان ایک مشکل انتخاب کرنا پڑ رہا ہے۔

اس دوران ایران اور امریکہ کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے اور جنگ بندی کی کوششوں میں پاکستان ایک مرکزی ثالث کے طور پر ابھرا ہے۔ اس وقت کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق، مذاکرات بے نتیجہ ختم ہو چکے ہیں اور دونوں ملکوں کے وفود اپنے اپنے ملکوں کو واپس جا چکے ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی کامیاب بیک چینل ڈپلومیسی اور سیاسی و عسکری قیادت کی کوششوں سے ایران اور امریکہ کے درمیان نہ صرف دو ہفتوں کی عارضی جنگ بندی ممکن ہوئی بلکہ پاکستان دونوں ملکوں کو مذاکرات کی میز پر بٹھانے میں بھی کامیاب رہا۔ پاکستان نے اس دوران ریاض، واشنگٹن اور تہران تینوں کے ساتھ اپنے دیرینہ اور تہ در تہ تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے خطے میں بڑے پیمانے پر جنگ کے پھیلاؤ کو روکنے کی مخلصانہ کوششیں کیں تاکہ دنیا بھر میں توانائی کے بحران اور معاشی نقصانات کو کم کیا جا سکے۔ اقوامِ متحدہ، مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ اور عالمی میڈیا نے ایران امریکہ کو مذاکرات کی میز پر بٹھانے میں پاکستان کی سفارتی کوششوں اور توازن برقرار رکھنے کی پالیسی کو کھلے دل سے سراہا ہے۔ حالیہ مذاکرات تادمِ تحریر اگرچہ بے نتیجہ ختم ہو گئے ہیں لیکن یہ ابھی ابتدائی دور تھا اور امن کی اُمیدیں ابھی ٹوٹی نہیں ہیں۔ جنگ بندی میں ابھی مزید کچھ دن باقی ہیں، ممکن ہے کہ اس دوران دونوں فریق ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیں اور جنگ کی دلدل سے نکلنے کی کوشش

کریں۔اللہ کرے کہ اب مشرق وسطیٰ کو مزید تباہی نہ دیکھنا پڑے۔

یہ جنگ جہاں تباہی اور بربادی لائی ہے وہیں کچھ ایسے امکانات کو بھی واضح کر رہی ہے جو علاقائی ریاستوں کے لیے امید اور روشنی کے دریچے کھولتے ہیں۔

طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے، حالیہ جنگ نے انکشاف کیا ہے کہ امریکا اور اسرائیل اب پہلے کے جیسے طاقت ور اور ناقابل شکست نہیں رہے۔ایران امریکا جنگ نے اسرائیل کو امریکا برطانیہ، اور یورپی ممالک کے لیے ایک بوجھ، جنگی الجھن اور ان کے مفادات کے لیے نقصان دہ عنصر بنا دیا ہے۔امریکا اس جنگ میں تنہا ہوا ہے، اسے کہیں سے بھی سیاسی اور عسکری تعاون نہیں ملا، جس پر صدر امریکا کی تلملاہٹ واضح طور پر دیکھی گئی، اس کے کئی اشتعال انگیز اور منفی بیانات نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ دنیا اب اسے سنجیدہ نہیں لے رہی۔ پاکستان کو اسلام آباد میں مذاکرات کی سیج سجانے کا موقع بھی اسی لیے مل پایا۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے پاس ایسا نادر موقع آیا ہے کہ وہ خود انحصاری کی جانب گامزن ہوسکیں، اور آزادانہ طور پر اپنی دفاعی، سیاسی اور معاشی پالیسیاں ترتیب دے سکیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ عالم اسلام ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے امریکی اثرات اور دباؤ کی کیفیت سے نکلے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ عالم اسلام باہمی اتحاد و اتفاق کا عملی مظاہرہ کرے، وہ مسلم ممالک جو خطے کے ہر پہلو کو امریکی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ خوئے غلامی کی اس دیرینہ روش کو ترک کریں۔

مسلم ممالک تنظیمِ اسلامی تعاون (OIC) کا فعال احیا کر کے امت کو ایک نئے دور اور روشن مستقبل کا تحفہ دے سکتے ہیں۔او آئی سی کے پلیٹ فارم سے امت مسلمہ کے سیاسی، معاشی اور عسکری مفادات کا بہترین انداز میں تحفظ کر سکتے ہیں۔ پاکستان اور ترکی کی عسکری قوت عالم اسلام کا بہترین اثاثہ بن سکتی ہے۔

اس سارے منظرنامے میں پاکستان اس وقت عالمِ اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک کلیدی مصالحت کار کے طور پر ابھرا ہے۔ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت نے تدبیر و حکمت اور بہترین سفارت کاری کے ذریعے جنگی ماحول کو امن و آشتی میں تبدیل کرنے کی کوششیں کیں، پاکستان کے اس کردار کو پوری دنیا میں سراہا جا رہا ہے۔

یہ موقع پاکستان کے لیے بھی ترقی و خوشحالی کی روشن کرنیں ساتھ لایا ہے۔ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کو اس بدلتے منظرنامے سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔اور وطن کی ترقی کے لیے کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا اور تمام عالم اسلام کا حامی و ناصر ہو، آمین!۔

احسان اور تصوف

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ ملت اسلامیہ کے زعیم وقائد، علم وفضل میں یکتا، مرشد کامل، شیخ طریقت اور اسلاف کی روایات کے بہت بڑے محافظ تھے۔ ذیل میں آپ کی ایک نایاب تقریر پیش کی جارہی ہے، اس میں آپ نے احسان وتصوف، بیعت، مشاغل طریقت کے متعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں سبق آموز بحث فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ ہم بھی اس سے سبق حاصل کرکے حیٰوۃ طیبہ اور اطمینان قلب کی دولت لازوال سے ہمکنار ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

میرے محترم بھائیو اور بزرگو! مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں کچھ بیعت اور سلوک وطریقت کے متعلق عرض کروں۔ آج کل کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چیز شریعت کے خلاف ہے، آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تعلیم نہیں دی ہے اور جو لوگ تصوف وطریقت کے ذمہ دار ہیں، ان کے افعال واطوار، حرکات وسکنات شریعت کے خلاف پائے جاتے ہیں، اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے خلاف ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔

بیعت۔ نام ہے اُس کا کہ شریعت کی کسی بات کے لئے عہد لیا جائے کہ وہ اس امر کو اللہ کے حکم سے انجام دیں گے یا کسی خاص دینی مسئلہ کا، کہ وہ اس پر عمل کریں گے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع میں ایسا کیا ہے، چنانچہ حدیبیہ کی لڑائی کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ اگر دشمنوں سے مقابلہ کی نوبت آئی تو وہ بھاگیں گے نہیں، بلکہ جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے اور موت آجائے تو اس کو اختیار کریں گے اور اسلام کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں گے۔ اللہ تعالیٰ سورہ فتح میں فرماتا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہوگیا جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے، پس اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کردیا اور ان کو فتح قریب عطا فرمائی۔

اسی طرح سورہ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے بیعت لینے کے متعلق ذکر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ۔ الآیۃ۔

اے نبی جب عورتیں تمہارے پاس آئیں اور عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور چوری نہ کریں گی اور زنا نہ کریں گی اور اپنے بچوں کو قتل نہ کریں گی۔

زمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ اپنے بچوں کو مرد عورت (ماں باپ) فقر وفاقہ کی وجہ سے قتل کرڈالتے تھے۔ فرمایا گیا ہے: لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ

''فاقہ کے خوف سے اپنے بچوں کو مت مارڈالو۔''

اسی طرح اور برائیوں میں لوگ مبتلا تھے، عہد لیا گیا کہ ان سب سے علیحدہ ہوکر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریں گی۔ ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان عورتوں سے بیعت لیجیے اور اُن کے لئے استغفار کیجیے، پس معلوم ہوا کہ بیعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ان بارہ صحابہ کرام میں سے ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کا داعی اور مبلغ (نقیب) بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ آپ جنگِ بدر میں شریک تھے جن کی مغفرت کا دنیا ہی میں اعلان ہو چکا تھا۔ یہی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت آپ کے گرد حاضر تھی۔ آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئا ولا تسرقوا۔ ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا اتو ببھتان تفترونہ بین ایدیکم وارجلکم۔ ولا تعصوا فی معروف فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ۔ ومن اصاب من ذٰلک شیئا۔ فعوقب فی الدنیا فھو کفارۃ لہ من اصاب من ذٰلک شیئا۔ فعوقب فی الدنیا فھو کفارۃ لہ ومن اصاب من۔ ذٰلک شیئا ثم سرہ اللہ فھو الی اللہ ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ۔ فبایعناہ علی ذٰلک (بخاری شریف کتاب الایمان)

مجھ سے بیعت کرو اس پر کہ اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانو گے، سرقہ اور زنا کا ارتکاب نہ کرو گے اور اپنی اولاد

(لڑکیوں کو) قتل نہ کرو گے اور بہتان نہ باندھو گے اور کسی بھی اچھے کام میں نافرمانی در حکم عدولی نہ کرو گے، پس جو شخص اس عہد کو پورا کرے اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جو شخص ان میں سے کسی جرم کا مرتکب ہو جائے پس اگر دنیا میں اس کو اس کی سزا مل گئی تو وہ کفارہ ہو سکتی ہے اور اگر دنیا میں اللہ نے اس کی پردہ پوشی کر لی تو پھر اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے معاف کرے اور اگر چاہے سزا دے۔ (راوی کہتے ہیں کہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد ختم کر چکے تو ہم نے آپ سے ان باتوں پر بیعت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں سے مختلف چیزوں پر بیعت لی ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی اس بات پر کہ ہم ہر مسلمان کی خیر خواہی کریں گے اور حفاظت کریں گے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے اس سے بچیں گے۔

حضرت سلمہ بن اکوع سے پوچھا گیا کہ حدیبیہ میں کسی چیز پر بیعت کی تھی تو کہا موت پر، یعنی اس پر کہ مر جائیں گے لیکن بھاگیں گے نہیں۔ کبھی بعض خاص باتوں پر بیعت کی، کبھی پوری شریعت پر، کبھی اس پر بیعت کی کہ کسی سے کوئی چیز مانگیں گے نہیں، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرام میں کسی کا کوڑا گر جاتا تھا، وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو خود ہی اُتر کر اٹھاتے تھے، یعنی کسی کو اٹھانے کے لیے نہیں کہتے تھے کہ کہیں یہ بھی سوال نہ ہو۔ مختلف جگہوں میں مختلف طریقہ سے قرآن اور حدیث میں ذکر آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی، کبھی کچھ چیزوں کے لئے کبھی پوری شریعت کے لئے۔

بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ قرآن و احادیث میں بہت سے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جن سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہ سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ بیعت اس بات پر ہوتی ہے کہ شریعت کے حکموں کی تعمیل کریں گے۔ اللہ کا ذکر کریں گے اور شریعت پر چلیں گے اسی کو بیعت طریقت کہا جاتا ہے۔ بیعت کے طریقے ہر زمانے میں جاری رہے ہیں اور اللہ کے خاص خاص بندوں نے مسلمانوں سے اس سلسلہ میں عہد لئے ہیں۔

بیعت کون لے سکتا ہے:

بیعت لینے کا ہر شخص کو حق نہیں، بیعت لینے کا حق اسی کو ہے جو فسق و فجور سے بچتا رہا ہو اور کسی پیر کے پاس رہ کر کتاب و سنت کی روشنی میں تزکیہ قلب حاصل کر چکا ہو اور اپنے مرشد سے نسبت باطنی حاصل کی ہو، ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ پر زمانہ سابق میں بیعت کی جاتی تھی۔ تمام صحابہ کرام میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے مگر حضرت علی کرم اللہ

وجہ سے خصوصاً سلسلہ زیادہ چلا ہے۔حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے۔

پیر یا شیخ:

حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاً رحمہم اللہ سے جو بیعت لیتے ہیں ان کو پیر کہتے ہیں۔پیر کے معنی بڑھاکے ہیں اور عربی میں اُسے شیخ کہتے ہیں۔

چونکہ عموماً وہ شخص جو زیادہ دنوں تک اللہ اور رسول کی اطاعت میں وقت گزارتا ہے اور تجربہ حاصل کرتا ہے اور پھر اشاعت وتبلیغ کا کام کرتا نام کرتا ہے بوڑھا ہوتا ہے اسی لئے اس کو پیر کہا جاتا ہے۔پیر کسی شخص کا نام نہیں ہے، کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ جو شریعت کا پابند اور عرصہ دراز تک ریاضت کئے ہوئے ہو وہ اللہ کی کثرت سے اطاعت کرتا ہو اور دنیا کا حریص نہ ہو، اس قدر عبادت کی ہو کہ اس سے نسبت پیدا ہوگئی ہو وہی پیر ہوتا ہے مگر عرصہ دراز گذرنے کے بعد جس طرح ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں اسی طرح طریقت کے اندر بھی کھرے کھوٹے پیدا ہو گئے۔جو شخص شریعت پر نہ چلتا ہو اور دسنت کا تابعدار ہو وہ شخص بیعت لینے کا مستحق نہیں ہے۔حکم ہوا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ۔

”اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ سے اور سچوں کے ساتھ رہو۔“

پیر وہ ہوتا ہے جو ہر طرح سچا ہو، جس کے اندر فریب نہ ہو۔پیر اس شخص کو بنایا جاتا ہے جو سچا ہو اللہ کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِهٖ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ

”اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالی سے ڈرو اور اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ایمان کا درجہ اول ہے اور ثانوی درجہ تقویٰ کا ہے اور تیسرا درجہ **وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ** کا ہے۔محققین کی رائے ہے کہ **وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ** سے مراد مرشد تلاش کرنا ہے۔چوتھا حکم ہے ”اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو“ سب سے پہلا جہاد یہ ہے کہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو۔

طریقت وتصوف سنت قدیمہ ہے:

طریقت وتصوف نئی چیز نہیں ہے بلکہ پرانی ہے، عرصہ سے چلی آتی ہے۔صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہیں تھا اس کے

کپڑے نہایت سفید تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب گھٹنے سے گھٹے ملا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے تعجب کیا وہ باہر سے آئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے کیونکہ ایسے آدمی کے جو سفر کر کے آیا ہو کپڑے بہت میلے اور گندے ہوتے ہیں۔ اس نے سوال کیا (ما الایمان ؟ ایمان کیا ہے؟) آپ نے فرمایا:

ان تومن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ وتومن بالبعث بعد الموت القدر خیرہ وشرہ (او کمال قال) الخ"

ایمان یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولوں پر اور فرشتوں پر اور قیامت پر اور اچھی اور بری تقدیر پر

اس کے بعد سوال کیا کہ اسلام کیا چیز ہے؟۔ فرمایا

ان تشھد ان لا الہ الا اللہ ان محمدا رسول اللہ ولا تشرک بہ شیئا وتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا

یعنی تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ ایک ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور روزہ رکھو، زکوٰۃ دو اور استطاعت ہو تو حج کرو۔

اس کے بعد سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے۔ فرمایا "تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُسے دیکھتے ہو اور اگر تم اس کو نہ دیکھتے ہو تو وہ تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔

احسان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ کیا گیا ہے۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ - دوسری آیت یہ ہے - ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ، اس طرح کی اور بھی آیتیں ہیں۔ آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم یکن تراہ فھو یراک.

کہ احسان نام ہے کہ اس چیز کا کہ خدا کی عبادت مکمل خضوع اور خشوع کے ساتھ انجام دو اور اس طرح عبادت کرو جس سے ظاہر ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، جیسے غلام آقا کو دیکھتا ہے تو نہایت توجہ سے کام کرتا ہے۔ کوتاہی نہیں کرتا۔ ہر عبادت کی تکمیل اس طرح کرو جیسے تم اپنے آقا و مالک کے دیکھنے کے وقت کرتے ہو۔

اور اگر تم کہو کہ ہم تو اللہ کو نہیں دیکھ سکتے تو یہ خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے، غلام کام کی تکمیل اس واسطے کرتا ہے کہ آقا اُس کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔

اسی احسان کے حاصل کرنے پر تمام تر تصوف کا مدار ہے۔

آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی مجلس میں ایمان کے ساتھ حاضر ہوتے ہی احسان حاصل ہو جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت اتنی قوی تھی کہ جو حاضر ہوتا تھا اس کے قلب پر ایسا اثر

پڑتا تھا کہ تمام چیزوں کو بھول جاتا تھا اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا۔

حضرت حنظلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی روز حاضر نہ ہوئے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اپنے آدمیوں کو یاد کرتے تھے۔ جب وہ ایک دو وقت نہیں آئے تو فرمایا حنظلہ کیوں نہیں آئے؟، لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں اور خبر لاتا ہوں۔

چنانچہ وہ ان کے گھر گئے گھر والوں سے پوچھا کہ حنظلہ کہاں گئے؟

بیوی نے کہا کہ گھر میں سر جھکائے گوشہ میں بیٹھے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اندر جا کر دیکھوں، اندر گئے دیکھا بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں، پوچھا کیوں نہیں آئے؟ حضرت حنظلہ نے کہا میں منافق ہوگیا ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کیسے؟ انہوں نے کہا رسول اللہ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو دنیا کی ساری باتیں فراموش ہوجاتی ہیں اور خدا سے تعلق رہتا ہے اور جب گھر آتا ہوں بال بچوں میں لگ جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہے اور پھر یہ بھی بیٹھ کر رونے لگے اور پھر فرمایا کہ ہماری تمام مشکلات کو حل کرنے والے وہی آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کے پاس چلو، رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی۔ چنانچہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری ایسی حالت ہوتی ہے آپ نے فرمایا اگر تم ہر وقت ایسے ہی رہو جیسے میرے سامنے رہتے ہو تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں۔ مگر یہ حالت وقتاً فوقتاً ہی ہوسکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب۔ اور صحابہ کے پاک اور صاف دل گویا آئینہ تھے۔ جب بھی آفتاب نبوت کے سامنے پہنچتے تھے اور حالت ہوجاتی تھی اور جب الگ ہوتے اُس میں فرق آجاتا تھا۔

مشاغل صوفیہ اور تزکیہ نفس:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چار کام سپرد کئے گئے تھے جن کا تذکرہ اس آیت میں ہے

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

قرآن حکیم کی آیتیں سناتے تھے، اس کا قرآن میں چار پانچ جگہ ذکر ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کا کلام سکھاتے تھے (۳) حکمت کی باتیں بتلاتے تھے (۴) اور چوتھا کام یہ کہ دلوں کے میل کچیل دور کرتے تھے اور ان کو پاک وصاف کرتے تھے اور ان کو پاک وصاف کرتے تھے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت سے اہل ایمان کے دلوں کے میل کچیل دور ہوجاتے تھے۔ غیر اللہ کی محبت اور ہر قسم کی برائی دور ہوجاتی تھی۔ **(بقیہ: صفحہ نمبر: ۳۳)**

تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں (۱)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

ایک زمانے میں دارالعلوم کے اساتذہ کرام ہر جمعرات کو کسی ضرورت کے موضوع پر اپنا کوئی لکھا ہوا مقالہ اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع میں پیش فرماتے تھے، رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کے ایک ایسے ہی اجتماع میں اس اہم موضوع پر زیر نظر مقالہ پیش فرمایا تھا، اجتماع کی صدارت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ افادۂ عام کے لئے اس مقالے کی پہلی قسط ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں:

پچھلے ایک سو سال کے عرصے میں عالم اسلام جن طرح طرح کے فتنوں اور شورشوں کا شکار رہا ہے، ان میں شاید سب سے زیادہ خطرناک اور صبر آزما فتنہ ''تجدّد پسندی'' کا فتنہ تھا، اس لئے نہیں کہ اس کے علمبرداروں کے پاس کچھ زیادہ معقول دلائل تھے، یا ان کی پشت پر کوئی ٹھوس فلسفہ تھا، بلکہ جس چیز نے اسے بہت خطرناک بنایا وہ اس کا جذباتی پہلو تھا، اس تحریک کا سنجیدہ تجزیہ کرنے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس تحریک کے پس منظر میں کل جدید لذیذ کا طفلانہ جذبہ کام کر رہا تھا، اور ہر نئی چیز کی طرف لپکنے کی خواہش نے اس میں نوجوانوں کے لئے بڑی کشش پیدا کر دی تھی۔

آنے والے صفحات میں ہم اس تحریک کا ایک تاریخی تجزیہ پیش کر رہے ہیں جس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ تحریک کن حالات میں کس طرح پیدا ہوئی پلی اور بڑھی؟ کن اسباب وعوامل (factors) نے اسے پروان چڑھایا؟ اس کے پس منظر میں کون سے جذبات کارفرما تھے؟ اور ان جذبات کے ارتقاء (Evolution) سے یہ

تحریک کتنے ادوار سے گذری؟ اور آج کس مرحلے میں ہے؟ اس کے بعد ہم اس تحریک کے افکار پر تنقید کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس تحریک کی فکر میں کیا بنیادی لغزشیں تھیں؟ **واللہ تعالیٰ الموفق والمعین**

"تجدّد" کا مفہوم:

لیکن ان تمام چیزوں سے قبل ''تجدّد'' کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، عربی لغت میں ''تجدّد'' کسی خارجی اثر کو قبول کر کے نئے ہوجانے کے ہیں، یہ لفظ درحقیقت انگریزی لفظ (Modernism) کا ترجمہ ہے، اس صدی کی ابتداء سے مستشرقین استعمال کرتے رہے ہیں، اس کی اصطلاحی تعریف جارج ٹائرل (George Tyrrel) اس طرح کرتا ہے:

> ''تجدّد اس بات کی خواہش یا کوشش کا نام ہے کہ نئے حالات کی روشنی میں ایک تاریخی تنقید وتحقیق کے ذریعے کسی مذہب کا ازسرِ نو تجزیہ کیا جائے۔''
>
> (Encyclopeadia Britannica V.15.P.638)

اس تعریف کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ: ''نئے حالات سے متأثر اور مغلوب ہوکر مذہب میں تبدیلی کی کوشش کو تجدّد کہا جاتا ہے''۔

تجدّد کی قدیم تحریکیں:

تجدّد کی تحریکیں مختلف شکلوں اور نئے نئے لباسوں میں اسلام کی قرونِ وسطی سے سامنے آتی رہی ہیں، اور عام طور سے جب کوئی نیا فلسفہ یا نئی تہذیب علم وتحقیق کا لبادہ اوڑھ کر مذہب کے مقابل آ کھڑی ہوتی ہے، تو ناپختہ ذہن اور سطحی علم رکھنے والے لوگ اکثر اس سے مرعوب ہوجاتے ہیں، چونکہ ان میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بلند بانگ دعووں کو دلائل کی کسوٹی پر جانچیں، اور اُن کی گہرائی تک پہنچ کر ان کے حسن وقبح کا فیصلہ کریں، اس لئے ان کی نگاہیں محض جدّت کی عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہوجاتی ہیں، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہوتے ہیں جو اس جدّت سے مرعوب ہونے کے بعد اپنے سابقہ عقائد ونظریات کو علی الاعلان بالکل چھوڑ دیتے ہیں، اور بعض وہ ہوتے ہیں، جو قدیم عقائد سے محبت کی بناء پر، یا کسی اور مصلحت سے انہیں چھوڑنے کا اقدام نہیں کرنا چاہتے، مگر ساتھ ہی نئے رجحان کو اپنانے کے لئے بھی انکا دل مچلتا رہتا ہے، اس مرحلے پر ان کے ذہن میں ایک کشمکش شروع ہوتی ہے، ایک طرف اپنے سابقہ عقائد سے ایک فطری لگاؤ انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ان سے منسلک رہیں، دوسری طرف نئی تہذیب یا نئے فلسفے کی چمک دمک ان کی آنکھیں خیرہ کرتی ہے، اس مشکل کا حل یہ لوگ عام طور

سے یہ نکالا کرتے ہیں کہ اپنے قدیم عقائد اور نئے رجحان کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بس یہیں سے ''تجدّد'' کی تحریک نمودار ہوجاتی ہے۔

یہاں ہم نے دولفظ استعمال کئے ہیں، ایک ''فلسفہ'' اور ایک ''تھذیب'' فلسفے سے مراد افکار ہیں جن کا تعلق عقائد اور نظریات سے ہے، اور تہذیب سے مراد زندگی گذارنے کا طریقہ ہے جس کا تعلق اعمال سے ہے، اسلام کا اپنا ایک فلسفہ بھی ہے، اور ایک تہذیب بھی، لہٰذا اگر کوئی نیا فلسفہ اسلامی فلسفے سے ٹکراتا ہے تب بھی ''تجدّد'' کے پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں، اور اگر کوئی تہذیب اسلامی تہذیب سے متصادم ہوتی ہے، تب بھی۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو دو مرتبہ نئے فلسفوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، اور تین مرتبہ نئی تہذیبوں کا۔

تہذیبوں کا ٹکراؤ:

جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، تو پہلی مرتبہ اسلام کو نئی تہذیب سے اس وقت سابقہ پڑا جب اسلامی فتوحات نے روم اور ایران کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے تھے، یہ دونوں تہذیبیں اس وقت قدیم دنیا کے علوم وفنون، ثقافت وادب اور تمدّن ومعاشرت کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں، اور مشرق ومغرب میں انہی کی شائستگی کا بول بالا تھا۔ لیکن جس وقت اسلامی تہذیب ان تہذیبوں سے ٹکرائی، اس وقت مسلمان تازہ دم، طاقتور، نشاط زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھے، ان کے دلوں میں تسخیر عالم کی امنگیں ابل رہی تھیں، اور ان کا ذہن اس یقین کی روشنی سے منوّر تھا کہ اگر اس دنیا میں کوئی صحیح نظریہ پایا جاتا ہے تو وہ ہمارا ہے، اور اگر کہیں کسی معقول، شائستہ اور بہترین تہذیب کا وجود ہے تو وہ ہماری ہے، ہماری تہذیب کے مقابلے میں کوئی تہذیب نہیں ٹھہر سکتی اور ہمارے نظریات کے آگے کوئی نظریہ کامیاب نہیں ہوسکتا، اس اعتماد ویقین نے ان کے دل ودماغ کو ہر طرح کے احساس کمتری سے آزاد کیا ہوا تھا، ان کی حیثیت دنیا میں ایک ابھرتی ہوئی فاتح قوم کی تھی، اور اس کے بالمقابل دنیا کی ہر قوم ایک مفتوح ومغلوب قوم کا درجہ رکھتی تھی، اس لئے مسلمانوں نے پوری خود اعتمادی اور خود شناسی کے ساتھ اس تہذیب کا مقابلہ کیا، کسی ذہنی غلامی یا مرعوبیت کے بغیر اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق اس تہذیب سے جائز حدود میں استفادہ بھی کیا، اور جس چیز کو چاہا، پہلے اسے اپنے سانچے میں ڈھالا، اور پھر اس کی صحیح جگہ میں اسے فٹ کر دیا، لیکن آزاد اور غالب ہونے کی بناء پر یہ استفادہ اس معاشرے کی روح اور اس کی اخلاقی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوسکا، مثلاً انہوں نے اپنی مقابل تہذیبوں سے جنگ کے بہت سے ہُنر بھی سیکھے، صنعت وتجارت میں ان کے مفید طریقوں کو اپنایا، مگر ان کو خالص اسلامی روح میں ڈھال کر جائز مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے جس چیز کو اسلامی مسلّمات کے خلاف سمجھا، اُسے بدل دیا، مگر سابقہ اسلامی تعلیمات پر آنچ

نہ آنے دِی۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبوں کے اس ٹکراؤ سے کوئی ''تجدّد'' کی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔

تہذیبوں کے ٹکراؤ کا دوسرا تجربہ اسلامی معاشرے کو اس وقت ہوا جب ساتویں صدی میں تاتاریوں نے عالم اسلام کے مرکزوں پر قبضہ کرلیا، اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیرنگیں ہوگئے، اس وقت اگرچہ مسلمانوں کی حیثیت فاتح کے بجائے مفتوح اور غالب کے بجائے مغلوب کی تھی، مگر خوش قسمتی سے یہ مغلوبیت صرف سیاسی نوعیت کی تھی، انہیں اس وقت جس فاتح سے سابقہ پڑا، وہ علم وفن کے ہر میدان میں مفلس اور تہی دست تھا، نہ اس کے پاس کوئی فلسفہ تھا، نہ تہذیب، وہ تمدن وحضارت سے قطعی نا آشنا ایک صحرانشین اور جنگجو قوم تھی جس نے کبھی تہذیب وتمدن کی شکل تک نہ دیکھی تھی، اس لئے یہاں بجائے اس کے کہ مفتوح قوم فاتح کا اثر قبول کرتی، الٹا فاتح نے مفتوح کا اثر قبول کیا، اور تاتاری قوم سیاسی طور پر غالب آجانے کے بعد کچھ ہی عرصے میں اسلام کے رنگ میں پوری طرح رنگ گئی، یہاں تک کہ وہ اسلام کی پرجوش علمبردار بنی، اور

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیبوں کے تصادم کے اس دوسرے تجربے نے بھی اسلام کی دلکش عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، اور اس ٹکراؤ سے بھی تجدّد کی کوئی تحریک رونما نہیں ہوئی۔

تہذیبوں کے ٹکراؤ کا تیسرا تجربہ وہ ہے جس سے ہم آج تک گذر رہے ہیں، عالم اسلام میں ہر جگہ نئی مغربی تہذیب اسلامی طرزِ زندگی سے ٹکرا رہی ہے، لیکن ہماری شومئ اعمال سے یہ تیسرا تجربہ پہلے دونوں تجربوں سے یکسر مختلف ہے، اس وقت ہمارے مقابلے پر جو قوم ہے اسے سیاسی میدانوں میں ہم پر بالادستی بھی حاصل ہے، اور اس کے پاس ایک نظر فریب اور بظاہر دلکش تہذیب بھی ہے، اور اس کی پشت پر ایک غلط یا صحیح فلسفہ بھی، دوسری طرف نہ تو ہم خود اعتمادی، ایمان اور یقین کا وہ جوہر رکھتے ہیں جو ہمارے اسلاف کو حاصل تھا، نہ ہمارے پاس وہ جوشِ عمل کی دولت ہے، جس سے ہمارے بزرگ مالا مال تھے، اور نہ ہمارے پاس وہ خارا شگاف تلوار ہے جس کی جھنکار نے کبھی قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج الٹ کر اس فضائے بسیط کو توحید کے نعروں سے معمور کردیا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں ہمارے نوجوانوں کے ذہن مرعوب ہیں، ان کے حوصلے پست، ہمّتیں شکستہ اور ولولے سرد ہیں، اور ان کا دل ودماغ احساس کمتری کے اُس مہلک روگ میں مبتلا ہے جو کسی قوم کے زوال کی آخری علامت ہوتا ہے۔ چنانچہ کمتری کا یہ احساس آج سے ایک صدی پیشتر تجدّد کی تحریک کو جنم دے چکا ہے، جو وقت کی رفتار کے ساتھ آکاس بیل کی طرح عالم اسلام پر چھاتی جارہی ہے۔ اور زیرنظر مقالے میں ہم اسی سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

فلسفوں کا تصادم:

تحریک تجدّد کے پیدا ہونے کا دوسرا امکان اس وقت ہوتا ہے، جب دو فلسفے ٹکرا جائیں، اور ہم نے ابھی عرض کیا کہ عالمگیر پیمانے پر یہ صورت اسلام کے ساتھ دو مرتبہ پیدا ہوئی ہے۔

ان میں سے پہلا موقعہ وہ تھا جب بنوعبّاس کے دور میں یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا، اور ذہین طبقوں میں اسے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا گیا، یہ فلسفہ اپنی روح کے اعتبار سے اسلام سے یکسر منافی تھا، اور ''عقلیّت'' کا نظر فریب لبادہ اوڑھ کر اسلام کے مقابلے پر آیا تھا، جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات اور اس کے فلسفے کو ٹھیک نہیں سمجھا تھا، انہیں اس فلسفے میں بڑی جان اور اس کے نظریات میں بڑی دلکشی محسوس ہوئی، چنانچہ ان میں سے بعض نے تو پورے طور سے اس فلسفے کو قبول کرلیا، اور اسلام سے علی الاعلان خارج ہوگئے، اور بعض لوگوں کو یہ جرأت نہ ہوئی، تو ان کی ذہنی کشمکش نے ''تجدد'' کی تحریک کو جنم دیا، اور یونانی فلسفہ اور اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کاوشیں شروع ہوگئیں، یونانی فلسفے کی رُو سے اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے تھے، ان سے بچنے کے لئے بہت سے لوگوں نے فلسفہ یونان پر آزاد تنقید کرنے کی بجائے خود اسلام کے نظریات میں ترمیم کرنی شروع کردی، جس کے نتیجے میں بیشمار کلامی فرقے پیدا ہوئے، معتزلہ، جبریہ، قدریہ، مجسّمہ وغیرہ سب اسی ''تجدد'' کی پیداوار ہیں۔

لیکن خدا کا پسندیدہ ابدی دین ان وقتی ہنگاموں سے مسخ ہونے والا نہیں تھا، اس دور کے علماء بیدار مغز، بلند حوصلہ، اور عالی ہمت تھے، انہوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ تنقیدی نگاہ سے پورے فلسفۂ یونان کو کھنگالا، اس کے اصول اور نفسیات سے واقفیت حاصل کی، اور پھر اس کے ایک ایک مزعومے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں، ان حضرات کی یہی کاوشیں آج تک علم کلام کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں، امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور امام غزالیؒ کی ''تہافت الفلاسفہ'' اسی سلسلے کی وہ کڑیاں ہیں جنہوں نے یونانی فلسفے کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا تھا، چنانچہ کچھ دن اقتدار اور قوت کے بل پر تو یہ فلسفہ زندہ رہا، مگر جب وہ اقتدار کی پشت پناہی سے محروم ہوا تو اس کی ساری عقلیت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور اس نے جن فرقوں کو جنم دیا تھا، وہ اپنی موت آپ مر گئے۔ آج معتزلہ، جبریہ، قدریہ اور جہمیہ کا نام اور ان کے کارنامے کتاب ''الملل والنّحل'' میں تو نظر آتے ہیں، مگر عملی دنیا میں ان کا ہر نقش باطل مٹ چکا ہے۔

یہ اسلامی فلسفے سے کسی دوسرے فلسفے کے تصادم کا پہلا تجربہ تھا، جو ہمارے اسلاف کی روشن خیالی، وسعت نظر اور معاملہ فہمی کی بناء پر سو فی صدی کامیاب رہا، اس کے بعد عالم اسلام کی مختلف جگہوں پر جزوی طور سے تجدّد کی

تحریکیں پیدا ہوئیں، مگر وہ عالمگیر نہ تھیں، مثلاً ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں دین الٰہی کا فتنہ اٹھا، اور ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگوں نے اسے اسلام کے مطابق ثابت کرنا چاہا لیکن حضرت مجدّد الف ثانی کی انتھک کوششوں نے اس فتنے کے بھی پرخچے اڑا دیئے۔

لیکن آج ہم اسی قسم کے ایک دوسرے عالمگیر تجربے سے دوچار ہیں، اور وہ مغربی فلسفے کے اسلام سے ٹکرانے کی بناء پر پیدا ہوا ہے، جس طرح اسلام کے پاس اپنا فلسفہ اور تہذیب دونوں ہیں، اسی طرح آج ترقی یافتہ مغربی اقوام کے پاس بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہیں، لہٰذا ان کی تہذیب ہماری تہذیب سے اور ان کا فلسفہ ہمارے فلسفے سے براہِ راست ٹکرا رہا ہے، اس ٹکراؤ سے پھر ''تجدّد'' کی تحریکیں نمودار ہوتی ہیں، اور احساسِ کمتری میں مبتلا انسانوں کا ایک گروہ ایک بار پھر مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب سے، اور مغربی فلسفے کو اسلامی فلسفے سے ہم آہنگ قرار دینے کی فکر میں ہے، اور ایک ایسا ''اسلام'' تیار کرنا چاہتا ہے جو مغربی طرز زندگی سے پوری طرح میل کھانے والا ہو، خواہ اس مقصد کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوجانا پڑے۔ یہی ''تجدّد'' کا وہ رُجحان ہے جس کے بارے میں ہم عرض کرچکے ہیں کہ وہ عالم اسلام کے ہر گوشے میں فتنے جگا رہا ہے، اور مسلمانوں کا کوئی خطّہ اس کی شورش سے خالی نہیں۔

''تجدّد'' کی یہ نئی تحریک پہلی تمام تحریکوں سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے نہیں کہ اس کے نظریات میں واصل بن عطا معتزلی یا جارُ اللہ زمخشری کے نظریات سے زیادہ جان ہے، بلکہ اس لئے کہ ہم میں اس وقت کوئی ابواسحٰق اسفرائینی یا فخرالدین رازی نہیں پایا جاتا، جو جدید فلسفے کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی عقلیّت کا طلسم توڑ دے، دنیا کے سامنے اس کی سطحیّت کو بے نقاب کردے۔ اور اس کا ایک ایک انگ عریاں کرکے دنیا کو دکھادے کہ یہ ہے اس ''عقل'' کی حقیقت جس کے بلند بانگ دعوؤں نے تم پر دھاک بٹھا رکھی تھی۔

جدید مغربی تہذیب بیشک خطرناک ہے، مگر اس لئے نہیں کہ وہ ایران اور روم کی قدیم تہذیبوں سے زیادہ طاقتور یا دلکش ہے، بلکہ اس لئے کہ ہم میں کوئی سعد بن ابی وقّاصؓ موجود نہیں جو اس تہذیب کے قالینوں کو اپنی خود اعتمادی کے نیزوں سے الٹ پھینکے۔

اس مقالے کے ذریعے ''تجدّد'' کی اسی تحریک کا اصلی رُخ دکھلانا منظور ہے، تاکہ آپ اس کے حقیقی پس منظر میں جھانک کر اس کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ سکیں، اور آپ میں سے کسی سعید روح کو اللہ توفیق دے تو وہ صحیح طریقے سے اس تحریک کا مقابلہ کرسکے۔

سیاسی پس منظر:

تجدّد کی یہ نئی تحریکیں جن حالات میں پیدا ہوئیں، ان کا تصور کرنے کے لئے آپ کو آج سے ایک صدی پہلے کے ماحول کا تصور کرنا ہوگا۔

یہ وہ وقت ہے جب مسلمان قوم صدیوں تک دنیا پر اپنے جاہ وجلال کی دھاک بٹھانے کے بعد اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمان حکمرانوں کے نشۂ عیش میں بدمست ہونے کے سبب ان کی سیاسی عظمت کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے تھے، بڑی بڑی سلطنتیں جن پر مسلمان صدیوں سے حکومت کرتے آئے تھے، رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے چھن رہی تھیں، دوسری طرف عوام کی تن آسانیوں کی وجہ سے تحصیل علوم کی وہ تڑپ فنا ہو رہی تھی جس نے دنیا کو جینے اور مرنے کے ڈھنگ سکھائے تھے، غرض جس پہلو سے دیکھئے، ایک انحطاط اور زوال تھا جو مسلمانوں پر مسلط ہو رہا تھا، ایک پستی تھی جس میں وہ گرے چلے جا رہے تھے، اور ایک زبردست تھکن تھی جس نے ان کے اعضا وجوارح، ذہن ودماغ اور قلب ونظر شل کر دیئے تھے۔

دوسری طرف مغربی قومیں جو اب تک غاروں میں پڑی سو رہی تھیں، ایک دم انگڑائی لے کر اٹھیں، تو انہوں نے میدان خالی پایا، ان کے دل میں تسخیر عالم کا ایک جذبہ پیدا ہوا، مسلمانوں کے زوال نے اس میں اور گرمی پیدا کی، اور وہ پوری تازہ دمی، نشاط زندگی اور حرارت کے ساتھ آگے بڑھیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر چھا گئیں، اور یکا یک دنیا کا نقشہ ہی پلٹ گیا، اب سیاست بھی انہی کی تھی، صنعت اور ہنر بھی انہی کے پاس تھا، تلوار پر بھی انہی کا قبضہ تھا، اور قلم پر بھی۔

اس مرحلے پر جب کہ مسلمان اپنے زوال کے انتہائی دور سے گذر رہے تھے، انہیں بیک وقت دو محاذوں پر مغرب کے صبر آزما حملوں کا سامنا کرنا پڑا، ایک طرف تو مغرب کی نشۂ فتح میں چُور تلوار تھی جو مکر وفن کی آڑ لے کر بڑھتی ہی چلی آ رہی تھی، اور دوسری طرف اس کا قلم تھا جو برابر مسلمانوں کے عقائد اور اعمال اور ان کے افکار ونظریات کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

اگر مسلمانوں میں قرونِ اولیٰ کا ایمان ویقین، حوصلہ، جرأت اور گرمیٔ اعمال ہوتی تو ان دونوں محاذوں پر مقابلہ کوئی مشکل نہ تھا، مگر شومیٔ اعمال سے قوم کا اکثر حصہ اسلاف کی اس مقدس میراث کو عیش وعشرت کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ اس کے ذہن وفکر اور اعضا وجوارح سے وہ تاب وتواں رخصت ہو چکے تھے جو ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر میدان میں شکست پر شکست کھاتے چلے گئے، اور اس زمانے میں جو نسلیں پیدا ہوئیں،

انہوں نے چاروں طرف مغرب ہی کا ڈنکا پٹتا دیکھا تو ان پر مغرب سے مرعوبیت کا ایک غیر معمولی احساس ایک کا بوس کی طرح مسلّط ہوگیا۔

لیکن ابھی تک مسلمان کے دل میں غیرت وحمیت کی ایک دبی ہوئی چنگاری باقی تھی، اسے کبھی کبھی یہ خیال آجاتا تھا کہ ہم بڑے عظیم اسلاف کی اولاد ہیں؟ اور ہمارا اصلی مقام یہ پستی نہیں جس میں ہم گر چلے ہیں، بلکہ وہ بلندی ہے جسے ہم نے اپنے ہاتھوں کھویا ہے، اگر چہ وہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے تھے مگر انہیں اب بھی ایک درجے میں اپنے دین اور اپنے تابناک ماضی پر فخر تھا، اور کبھی کبھی اس کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ ان میں بیدار ہوجاتا تھا۔

مغرب کو اس دبی ہوئی چنگاری سے خطرہ تھا کہ کہیں کسی وقت یہ بھڑک کر ایک شعلہ نہ بن جائے، جو ہمارے اقتدار کی خوشنما عمارت کو جلا کر خاکستر کردے، چنانچہ اس نے اس موقعہ پر پوری مکاری کے ساتھ ایک اور کاری وار کیا، جس سے مسلمانوں کی رہی سہی قوت پارہ پارہ ہوگئی۔

یہ کاری وار ''نیا نظامِ تعلیم'' تھا، جو پوری ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کا ہمدرد بن کر ان پر مسلط کیا گیا، اس نظامِ تعلیم میں چُن چُن کر اسلام سے بیزاری اور نفرت پیدا کرنے والے مضامین مسلمانوں کو پڑھائے جاتے تھے، اور ایک ایک قدم پر یہ رعایت رکھی جاتی تھی کہ مسلمان اپنی صحیح ذہنیت کھو بیٹھیں، وہ مسلسل اپنے افکار ونظریات، عقائد واعمال، اپنی تاریخ وروایات اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے دور ہوتے چلے جائیں، ان کے ذہن پر مغربی افکار کا غلبہ ہوتا چلا جائے، اور ان کے دل میں مغربی مفکّروں کی عظمت کا سکہ بیٹھتا جائے۔

اس مکّارانہ چال نے مسلمانوں کی خود اعتمادی کی گرتی ہوئی دیوار پر آخری ضرب کا کام کیا، یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت ایک قسم کی خاموش ''نسل کشی'' تھی، جس کے مراکز اسکولوں اور کالجوں کے سنہرے نام سے عالم اسلام کے گوشے گوشے میں قائم کئے گئے، اور جہاں مسلمانوں کے نونہال بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے دِل ودِماغ کا آپریشن کراتے رہے۔

اس نظام تعلیم کے ذریعے پڑھ کر جو نوجوان نسل تیار ہوئی، وہ ایک طرف تو مغرب کی بالادستی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اور دوسری طرف پندرہ سالہ تعلیم کے دوران ان کا ذہن جس سانچے میں ڈھل کر نکلا تھا، اس نے ان کے دماغ میں یہ الفاظ بڑے نمایاں طور سے کندہ کردیئے تھے کہ ''مغرب برتر ہے اور مشرق کمتر'' ان کے ذہن میں اس کے برعکس مشرق کی برتری اور مغرب کی کمتری کا کوئی تصور آتا ہی نہیں تھا، اور آتا کیسے؟ ان کے معلّموں نے انہیں

مغرب کے تو بیشمار مفکرین، سائنس دانوں اور فاتحین کے نام اور کارنامے یاد کرائے تھے، مگر کسی مسلمان مفکر، مصلح یا فاتح کا نام انہیں یاد نہ تھا، جو انہیں بتاتا کہ

''وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا''

اگر کسی کو اپنے اسلاف کے نام یاد بھی تھے تو اس کے پاس ان کے کارنامے مسخ شدہ شکل میں پہنچ سکے اور اگر کسی کو اپنے اسلاف کے کارناموں کا صحیح علم تھا تو اس کے ذہن میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، کیونکہ مغربی فلسفۂ زندگی اس کی ذہنیت پلٹ چکا تھا۔

اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا، ان کے دِل میں یہ بات پوری طرح جم گئی کہ ہمارے زوال اور پستی کا سبب وہ فرسودہ تہذیب اور معاشرت ہے، جسے ہم تیرہ صدیوں سے اختیار کئے ہوئے ہیں، اگر ہم اپنی اس پستی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں تمام مغربی طور طریقوں کو بلا تنقید اپنانا ہوگا ہمارے لئے ترقی کی راہ ہے تو بس یہی، اور وقت ہے تو بس اسی کا۔

بس یہی وہ مہلک جذبہ تھا جس نے سینکڑوں مسلمانوں کو دہریہ بنا دیا، اور وہ لوگ جو اپنے مذہب سے محبت کے سبب، یا ماحول کے طعنوں سے ڈر کر اسلام کو علی الاعلان خیر باد نہ کہہ سکے، اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے جو ایسے حالات کا لازمی خاصّہ ہے، ایک طرف نئی تہذیب کی چمک دمک اختیار کرنے کے لئے ان کا دل مچل رہا تھا، اور دوسری طرف وہ جس ماحول میں بستے تھے، وہ مسلمان تھا، جن لوگوں کے ساتھ ان کی رسم وراہ تھی وہ مسلمان تھے، جس ملک میں وہ پیدا ہوئے تھے وہ مسلمانوں کا ملک تھا، اس لئے نئی تہذیب کو اختیار کرنے کے لئے اس سوسائٹی کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اس کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لئے انہوں نے وہی ''تجدّد'' کی تحریک شروع کی، اور اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اپنا زور صرف کیا کہ مغربی طرز معاشرت اسلام سے چنداں مختلف نہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ تحریک چار فکری ادوار سے گذری جو پچھلی ایک صدی کی تاریخ میں یکے بعد دیگرے نمایاں نظر آتے ہیں۔

مغربی تجدّد کا پہلا دور:

عالم اسلام میں مندرجہ بالا حالات کا پہلا مظاہرہ ترکی میں ہوا، جب وہاں ترکوں کی سیاسی کمزوری کے بعد مغربی تہذیب خم ٹھونک کر اسلام کے مقابلے پر آئی، تو بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسے آگے بڑھ کر لبیک

کہا، اور اسلام میں تحریف وترمیم کا دروازہ کھول دِیا، لیکن ان لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت جس نے ترکی کے فکری دھارے کو موڑا، ضیاء گوک الپؔ (۱۸۷۵ء ۱۹۲۴ء) کی شخصیت تھی، ضیاء گوک الپؔ ترکی میں بلکہ پورے عالم اسلام میں مغربی تجدّد کا پہلا سرگرم علمبردار تھا، یہ شخص ۱۸۷۵ء میں دیار بکر میں پیدا ہوا، اور دیار بکر کے سیکنڈری اسکول میں پڑھنا شروع کیا، اسکول کا ہیڈ ماسٹر آزاد خیال اور حریت پسندی (Liberalism) کے خیالات رکھتا تھا، کچھ عرصے کے بعد ایک یونانی استاذ کے اثر سے اس کے ذہن میں عقیدے اور عقل کی کشمکش شروع ہوئی، اس نے اسلامی فلسفے اور تصوف سے شفاء حاصل کرنا چاہا، مگر بقول اس کے اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی، اور وہ ارتیابیّت میں گرفتار ہوگیا، اس کے بعد سے اُنے مختلف انجمنوں، اخباروں، رسالوں اور مضامین کے ذریعے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کی دعوت دی، وہ کہتا تھا کہ درحقیقت مغربی تہذیب ہماری اپنی تہذیب ہے، اور اس کے نشوونما میں ترکوں اور مسلمانوں کا خاص حصہ رہا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے اختیار نہ کریں، چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

''مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا پھیلاؤ (Continuation) ہے، اس تہذیب کے بانی سماری، سیتھی، فینقی، رعاۃ ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے، تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لئے کہ وسطِ ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے، اس کے عرصے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، اس بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں، اور ہمارا اس میں حصہ ہے''۔(۱)

مغربی تہذیب کا اختیار کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس سے کیا انقلاب رونما ہوگا؟ اور ترکی کے جسد مردہ میں اس سے کس طرح جان پڑ جائے گی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> ''جب کوئی قوم اپنے نشوارتقاء کا ایک بڑا فاصلہ طے کرچکتی ہے، تو اپنی تہذیب کا تبدیل کرنا ضروری سمجھتی ہے، جب ترک خانہ بدوش قبائل کی حیثیت سے وسط ایشیا میں تھے تو اس وقت وہ مشرق بعید کی تہذیب کے اثر میں تھے جب سلطنت عثمانی کے عہد میں آئے تو بازنطینی دائرہ اثر میں داخل رہے، اور جبکہ وہ عوامی دور حکومت کی طرف منتقل ہورہے ہیں، انہوں نے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مصمّم ارادہ کرلیا ہے''۔(۲)

یہاں سوال پیدا ہوا کہ ترکی تو مسلمان ہے، اور مغربی تہذیب کی بیشمار چیزیں اسلام سے متصادم ہیں، پھر ترکی کس طرح اس تہذیب کو قبول کرسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اس نے جو نظریہ پیش کیا، وہ ''مغربی تجدّد'' کا

پہلا نظریہ ہے، یعنی یہ کہ ''اسلام'' اور ''تہذیب'' دو بالکل جدا چیزیں ہیں، مذہب کا تعلّق صرف چند عقائد وعبادات اور رسموں سے ہے، اسلامی زندگی کے دوسرے مسائل اسلام کے دائرے سے باہر ہیں، ان میں ہر شخص اپنا پسندیدہ طرز اختیار کرسکتا ہے، اور اسی چیز سے اسلام منع نہیں کرتا، اگر ایک انسان اسلامی عقائد اور عبادات کا پابند ہے تو وہ پکا مسلمان ہے خواہ زندگی کے دوسرے مسائل میں وہ مغربی تہذیب کا پابند ہو یا مشرقی تہذیب کا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ''جب واقعہ یہ ہے کہ مذہب صرف ان مقدس اداروں، عقائد اور مراسم کے مجموعے کا نام ہے تو وہ ادارے جو مذہبی تقدس نہیں رکھتے (مثلاً سائنسی افکار، صنعتی آلات واوزار، جمالیاتی معیار) ایک علیحدہ نظام کی تشکیل کرتے ہیں جو مذہب کے دائرے سے خارج ہوتا ہے، ایجابی علوم جیسے ریاضیات، طبعیات، علم الحیات، نفسیات، عمرانیات، صنعتی طریقے اور فنون لطیفہ کا مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ کسی تہذیب کا بھی مذہب سے انتساب درست نہیں ہے، نہ مسیحی تہذیب کا کوئی وجود ہے، نہ اسلامی تہذیب کا، ٹھیک جس طرح سے مغربی تہذیب کو مسیحی تہذیب کہنا صحیح نہیں، اسی طرح مشرقی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہنا بھی درست نہیں''۔ (۳)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کے شوق میں اسلام کو صرف چند رسموں کا مجموعہ قرار دیدیا گیا؟ اور اس بات سے یکسر قطع نظر کرلی گئی کہ اسلام دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے، اسے مسیحیت پر قیاس کرنا حقائق کو جھٹلانا ہے، اس کا اپنا ایک مستقل نظام حیات ہے، اس نے صرف عبادتیں ہی دنیا کو نہیں سکھائیں، بلکہ اس کے قانون وشریعت کا تین چوتھائی حصہ معاملات اور زندگی کے عام مسائل سمجھانے میں صرف ہوا ہے۔

بہرکیف! ضیاء گوک الپؔ کے یہ افکار تھے، جو اس زمانے کے ہر حریت پسند نوجوان کی دلی آواز بن گئے، انہی افکار سے متأثر ہوکر مصطفیٰ کمال پاشا نے وہ ہولناک انقلاب ترکی میں برپا کیا جس کی تلخ یاد آج بھی ایک حساس مسلمان کے دِل میں ایک طوفان بپا کردیتی ہے، پھر چونکہ مصطفیٰ کمال پاشا اپنے اس انقلاب میں اپنی شدید آمریّت کی بناء پر کامیاب ہوگیا تھا، اور اس نے مذہبی طبقوں کو کچل کر اس کشمکش کا خاتمہ کردیا تھا جو عرصے سے آزاد خیال اور مذہبی طبقوں میں جاری تھی، اور جس کی بناء پر ترکی کا استحکام خطرے میں پڑ گیا تھا، اس لئے اس کی نام نہاد اصلاحات کے بعد واقعۃً ترکی کو مادّی طور پر ترقی ہوئی، اور مملکت ایک درجے میں مستحکم ہوگئی۔

ان وجوہ کی بناء پر مصطفیٰ کمال پاشا تمام عالم اسلام کے آزاد خیال طبقے کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بن گیا،

اسلامی ممالک کے برسر اقتدار طبقے اور سیاسی لیڈروں میں ہمیں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے اتنی محدود اور سطحی صلاحیت اور اخلاقی پستی کے باوجود لوگوں کے دِل ودماغ پر حکومت کی ہو، اور انہیں اپنی شخصیت سے اس قدر متأثر کیا ہو کہ جتنا کمال اتاترک نے کیا۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے ترکی کو اجنبی اقتدار سے اس وقت بچایا تھا، جبکہ ترکی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا، اس وقت کے عام مسلمان پوری دنیا میں عزت وآزادی کے حصول کے لئے بے چین تھے، اس لئے ان کی نگاہوں میں ہر وہ شخص ایک محبوب ہیرو بن جاتا تھا جو کسی اسلامی ملک کو مستحکم کرنے کا بیڑا اٹھائے، خواہ اس کے لئے اس نے ملک کو اس کی اخلاقی ومذہبی روح کے اعتبار سے دیوالیہ ہی کیوں نہ کر دیا ہو،

ان اسباب کی بناء پر ترکی پورے عالم اسلام کے لئے ایک مثالی حکومت بن گئی، اور اسلامی دنیا میں ہر جگہ وہی نعرے دہرائے جانے لگے جو ترکی میں ضیا گوک الپؔ، ضیا پاشا، احمد مدحت آفندی، اور مصطفیٰ کمال لگا چکے تھے۔

ضیاء گوک الپؔ نے مذہب کو تہذیب سے جدا کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا، یہی نظریہ عربی ممالک میں شیخ علی عبدالرزاق نے اپنی کتاب ''الاسلام وأصول الحکم'' میں پیش کیا، اور اسی نظریہ کو لے کر ہندوستان میں مولوی چراغ علی آگے بڑھے، جس کی تفصیل ہم عنقریب عرض کریں گے۔

اور ہر آزاد خیال شخص انہیں دہرانے لگا، یہاں تک کہ ایک ترک مضمون نگار نے لکھا کہ:

> ''ہم ایک ترکی اسلام تشکیل دینا چاہتے ہیں، جو خالص ہمارا ہوگا، جو ہماری نئی سوسائٹی سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس میں اچھی طرح مدغم ہو سکے''۔ (۴)

ہندوستان میں تجدّد کا ارتقاء:

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے، وہ اپنے ساتھ جدید علوم جدید تنظیمات اور اس کے متعلقہ آلات ومصنوعات کا ایک بڑا لشکر ساتھ لائی، ہندوستانی مسلمان اس وقت زخم خوردہ اور شکستہ خاطر تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان کی عزت وخودداری کو ایک کاری ضرب لگی تھی، اس لئے وہاں اس کے فوراً بعد تجدّد کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں،

۱۸۶۳ء میں کلکتہ کے اندر ''محمڈن لٹریری سوسائٹی'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کی بنیاد خان بہادر نواب عبداللطیف نے رکھی تھی، اس انجمن کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی تہذیب وثقافت سے قریب تر کرنا تھا، اس انجمن کے بانیوں کا نعرہ یہ تھا کہ ''برطانوی حکومت اتنی طاقتور ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی

تہذیب اتنی مفید ہے کہ اس سے ناواقف رہنا مسلمانوں کے لئے مُضر ہوگا''۔(۵)

اس انجمن نے مذہب، سماج، معاشیات اور سیاست غرض ہر میدان میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے آگے سپر ڈالنے کا مشورہ دیا، بعض علماء کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی، اور حکومت برطانیہ کی وفاداری کو ناجائز قرار دیا گیا، تو اس انجمن کی طرف سے ایک فتویٰ مرتب کیا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے، اس لئے اس کے خلاف جہاد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن علمائے حق کی طرف سے ان کے اس تخیل کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی، اور اسی کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب کنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا۔

یہ انجمن جو ہندوستان میں تجدّد کی پہلی علمبردار تھی، کس مقصد کے لئے اٹھی تھی؟ اور اس کے پس منظر میں کیا جذبہ کارفرما تھا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر ولفریڈ سی اسمتھ لکھتے ہیں:

> ''اس انجمن میں جو لوگ نمائندگی کر رہے تھے، وہ ہندوستانیوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو برطانوی حکومت کا مکمل وفادار تھا، اور اس پر ان کا وجود اور بقا موقوف تھی، اگر ان کے نزدیک مذہب کوئی معنی رکھتا تھا تو وہ لازماً ان کی اس پوزیشن کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔
>
> (Modern Islam in India p.6)

لیکن یہ انجمن جو تجدّد کا مقصد لے کر اٹھی تھی، اپنے مقاصد میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکی، اور عام مسلمان اسے نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتے رہے، لہٰذا اس کا دائرہ اثر بہت محدود رہا۔ (جاری ہے)

حوالہ جات:

(۱) Western Civilstion And Turkish Nationalism, بحوالہ ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' از مولانا ابوالحسن علی ندوی

(۲) ایضاً ص: ۲۷۱، بحوالہ مذکور

(۳) ایضاً ص: ۲۷۱، بحوالہ مذکور۔

(۴) Islam in Modern History by pro Smith p:193

(۶) Modern Islam in India p:5

عمل تدریس میں استاد کا کردار

مولانا زاہد الراشدی

دینی مدارس میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس مناسبت سے اساتذہ کرام سے چند گزارشات پر مبنی یہ گفتگو جو چند برس قبل ایک تعلیمی سیمینار میں کی گئی تھی، پیش خدمت ہے۔

مجھ سے کہا یہ گیا ہے کہ اپنے تدریسی تجربات، مشاہدات اور تاثرات پیش کروں۔ پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مجھے بھی ایک چھوٹا سا مدرس ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور میرا تدریسی تجربہ تقریباً 50 سال پر محیط ہے، الحمد للہ!۔ چونکہ میں نے ایک تدریسی گھرانے میں ہوش سنبھالا تھا، اس لیے معلمی میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے جس گھرانے میں ہوش سنبھالا، میری والدہ صاحبہ خود استانی اور معلمہ تھیں۔ قرآن کریم پڑھاتی تھیں، ترجمہ، حفظ، تفسیر اور اس زمانے میں بہشتی زیور بھی پڑھاتی تھیں اور یہ بھی تحدیث نعمت کے طور پر عرض کروں گا کہ سابق صدر جناب رفیق تارڑ صاحب میری والدہ اور والد محترم کے شاگرد تھے۔ تدریسی ماحول مجھے گھر سے، ماں کی گود سے ملا ہے۔

والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ علیہ کا کہنا ہی کیا! وہ تو برصغیر کی سطح کے بڑے مدرسین میں سے ہیں۔ ان کا اپنا تدریسی دورانیہ کوئی ساٹھ سال سے زائد رہا ہے، انہوں نے ساٹھ سال دینی علوم کی تدریس کی ہے۔ میرے لیے مشکل بات اس لیے نہیں تھی کہ ماحول ہی وہ تھا، تربیت ہی وہ تھی، ذوق ہی وہ تھا، ہر وقت ارد گرد پڑھنے پڑھانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میں نے تدریسی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں کر دیا تھا، شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے۔ اس زمانے میں درجات کی تقسیم یہ ثالثہ، رابعہ وغیرہ کے عنوان سے نہیں ہوتی تھی۔ موقوف علیہ ہوتا تھا، کافیہ کا سال ہوتا تھا، جامی کا سال ہوتا تھا، اس حوالے سے ہم متعارف ہوتے تھے۔ شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے کا سال تھا کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دو تین طلبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمیں ''مالا بدمنہ'' پڑھائیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پڑھا دوں گا۔ تو سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھائی، وہ ہے ''مالا بدمنہ''۔ تین طلبہ تھے اور اسے ہم نے باقاعدہ کلاس کی صورت میں چلایا۔ یہ میری تدریسی زندگی کا آغاز تھا۔

میری تدریسی زندگی 1970ء میں باقاعدہ شروع ہوئی ہے۔ 1970ء سے 1990ء تک بیس سال میں نے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں پڑھایا جو کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے ساتھ گوجرانوالہ کا سب سے قدیمی

مدرسہ ہے۔ یہ 1962ء میں قائم ہوا تھا اور میرے والد محترم اور چچا محترم حضرت صوفی صاحب دونوں نے بنیادی تعلیم وہیں حاصل کی۔ یہاں بیس سال مجھے تدریس کا موقع ملا، لیکن وہ تدریس ایسی تھی کہ میں ایک طرف تو جمعیت علماء اسلام کے سرگرم ترین حضرات میں سے تھا، میری صبح کہیں ہوتی تھی، دوپہر کہیں، شام کہیں اور رات کہیں ہوتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب سے زیادہ متحرک تھا، لیکن متحرک ترین لوگوں میں سے تھا، الحمدللہ۔ ملک کے بیشتر حصوں میں میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ جماعتی سرگرمیاں، سیاسی، تنظیمی سرگرمیاں، معرکہ آرائی، تحریکیں، گرفتاریاں سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ تحریکی اور سیاسی سرگرمیوں کے لحاظ سے یہ میرا کلائمیکس کا دور تھا، یعنی 1970ء سے 1990ء تک۔ اس حوالے سے میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر میرے والد بھی تھے، شیخ بھی تھے، استاد بھی تھے، مربی بھی تھے، سب کچھ وہی تھے۔ ان کے ساتھ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی میرے چچا تھے، استاد تھے، مربی تھے۔ اس دور میں اتنی متنوع اور وسیع سیاسی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ میرا ذوق شروع ہی سے یہ ہے کہ میں تقریباً تمام مکاتب فکر سے رابطہ رکھتا تھا اور رابطہ رکھتا ہوں، اس درجے کا کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو ہم اکٹھے چل سکیں۔ یہ رابطہ میرا طالب علمی کے زمانے میں تھا کہ کسی دینی تحریک میں ہمیں اکٹھا چلنا پڑے تو حجاب نہ ہو کہ وہ کون ہے، میں کون ہوں۔ اسے آپ میرا ذوق کہہ لیجیے، پینتالیس پچاس سال سے یہ میرا معمول ہے۔ مجھے یہ خدشہ ہوتا تھا کہ میرے والد محترم جس ماحول کے بزرگ ہیں، شاید میری یہ وسیع سرگرمیاں ان کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ لیکن انہوں نے جماعتی، اتحادی، تحریکی یا سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہاں، البتہ دو باتوں کی مجھ پر ہمیشہ پابندی رکھی اور ان باتوں پر وہ ڈانٹتے بھی تھے۔ ایک انہیں اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہوا ہے، رمضان میں سنا رہا ہے یا نہیں سنا رہا؟ ماہ رجب میں ہی مجھ سے پوچھنا شروع کر دیتے تھے کہ کہاں سنا رہے ہو، کیا تیاری کر رہے ہو، کتنی منزل پڑھتے ہو؟ رمضان میں بلا کر پوچھتے تھے کہ کتنے پارے ہو گئے، کتنی غلطیاں روز آتی ہیں، سناتے کس کو ہو، دور کس سے کرتے ہو؟ دوسرا ان کا اصرار ہوتا تھا کہ تم جو مرضی کرو، لیکن دو چار کتابیں لازمی پڑھانی ہیں۔ سچی بات ہے کہ پہلے دس سال میں نے مجبوری سے پڑھایا۔ ڈر ہوتا تھا کہ والد صاحب ڈانٹیں گے، پوچھیں گے۔ رمضان کے بعد شوال میں ہی بلا لیا کرتے تھے اور پوچھتے تھے کیا پڑھا رہے ہو، کتنے سبق ہیں، کیا مطالعہ کرتے ہو؟ وہ تو پرانے مدرس تھے، اس لیے سبق کے بارے میں پوچھتے تھے کہ فلاں جگہ کیسے حل کی تھی، فلاں موقع طلبہ کو کیسے سمجھایا تھا؟ الحمدللہ مجھے یہ نگرانی حاصل رہی ہے۔

پہلے دس سال تک میں تقریباً یہ سمجھتا رہا کہ میں مجبوراً پڑھا رہا ہوں، لیکن آہستہ آہستہ ذوق بنتا گیا اور الحمدللہ آج یہ

ذوق ہے کہ اگر دو چار سبق نہ پڑھاؤں تو دن گزرتا نہیں ہے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ پہلے پہلے غصہ آتا تھا کہ میں سیاسی لیڈر ہوں، اخبارات میں میرے مضامین چھپتے ہیں اور میرے بیانات آتے ہیں، جبکہ والد صاحب مجھ پر سختی کرتے ہیں کہ تم نے ''اصول الشاشی'' ضرور پڑھانی ہے، ''نورالانوار'' ضرور پڑھانی ہے اور ''ہدایہ'' ضرور پڑھانی ہے۔ میں اپنے مدرس دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ والد صاحب کا جبر کہہ لیجیے یا کچھ اور کہ آہستہ آہستہ اپنا ذوق بھی بن گیا کہ میں نے ایک عرصہ اس طرح گزارا کہ دوسری سرگرمیوں کے باوجود تدریس ضرور کی۔ البتہ میں نے ایک سہولت یہ لے رکھی تھی کہ سبق اپنی مرضی کے لیتا تھا، تین یا چار، اور اپنی مرضی کے وقت پر پڑھاتا تھا۔ اپنی سرگرمیوں کے ساتھ مجھے اسباق کو ایڈجسٹ کرنا ہوتا تھا۔

بیس سال تک میرا یہ معمول رہا ہے کہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتا تھا (اب بھی پڑھاتا ہوں، درس دیتا ہوں) اور پھر مصلے پر تین چار سبق پڑھاتا تھا اور نماز کے ڈیڑھ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد فارغ ہوجاتا تھا۔ پھر میں آزاد ہوتا تھا کہ کبھی مردان جارہا ہوں تو کبھی پشاور۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ساری رات سفر کرکے سحری کے وقت واپس آتا تھا، نماز سے ایک گھنٹہ پہلے مطالعہ کرتا تھا، نماز کے بعد پڑھاتا تھا۔ پھر اگر سونا ہے تو سوگیا، ورنہ بس پر جاکر سوار ہوگیا اور وہیں سوگیا۔ یہ میرا تقریباً بیس سال تک معمول رہا، اس زمانے میں میری نیند اکثر بس میں ہی پوری ہوتی تھی۔ یہاں ایک لطیفے کی بات یاد آگئی۔ ایک دن حضرت والد صاحب پوچھتے ہیں کہ خدا کے بندے! تم سوتے کہاں ہو؟ آج اخبار میں پڑھتے ہیں کہ کوئٹہ بیٹھا ہوا ہے، کل پڑھتے ہیں کراچی میں ہے، پرسوں پشاور میں ہے، ترسوں میرپور میں ہے، اور سبق بھی پڑھاتے ہو، آخر سوتے کدھر ہو؟ میں نے کہا جی بس سوجاتا ہوں۔

اس زمانے میں میری حالت یہ تھی کہ تین چار گھنٹے بس میں سونا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی، اب بس میں نیند نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ والد صاحب کے ساتھ گوجرانوالہ سے ایک بارات پر جانا پڑگیا۔ والد صاحب کے بہت قریبی تعلق والے دوست تھے اور انہوں نے مجبور کیا کہ آپ بیٹے کی بارات پر چلیں۔ چنیوٹ سے آگے لالیاں جانا تھا۔ بڑی ویگن تھی۔ ویگن میں باپ بیٹا دونوں کو ایک ساتھ سیٹ مل گئی۔ میں جب گوجرانوالہ سے نکلا تو مجھے اتنا یاد ہے کہ قلعہ دیدار سنگھ شاید گزرا تھا، اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہاں کہاں سے گزرے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد جب چنیوٹ پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ والد صاحب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر کہا کہ ''اٹھو! نماز پڑھو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کہاں سوتے ہو۔'' تو بیس سال میرا یہ معمول تھا اور میرا اختیار ہوتا تھا کہ میں اپنی مرضی کے اسباق لوں گا اور دوسرا یہ کہ وقت میری مرضی کا ہوگا کہ کچھ بھی ہو، صبح کی نماز کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے میں، میں نے سبق پڑھا کر فارغ ہوجانا ہے، اور الحمدللہ میں نے اس کو نبھایا ہے۔

میرا زیادہ تر تدریسی ذوق تھا فقہ، اُصول فقہ، صَرف اور ادب کا۔ میرے زیادہ تر اسباق جن کتابوں میں سے ہوتے تھے اُن میں ''نورالانوار''، ''اصول الشاشی''، ''حسامی''، ''ہدایہ''، ''کنز'' اور ''صَرف'' کی کتابیں شامل تھیں۔ اور (عربی ادب کی کتاب) ''حماسہ'' تو میری پکی کتاب تھی۔ الحمدللہ! آج بھی میرا ذوق یہ ہے کہ والد صاحب کی تربیت اور سختی کی وجہ سے میری دیگر سرگرمیوں کے باوجود پچھلے پورے سال میں میری صرف تین چھٹیاں تھیں، حالانکہ اٹھارہ چھٹیوں کی مدرسے کی طرف سے اجازت ہے۔ مدرسے کے قواعد وضوابط میں ہے کہ اٹھارہ اتفاقی چھٹیاں استاد کا استحقاق ہے۔ پچھلے سال میں نے صرف تین استعمال کیں اور اس سال اللہ کرے وہ بھی نہ ہوں۔

تو والد صاحب کا سبق یہ ہوتا تھا کہ بھئی، ناغہ نہیں کرنا۔ وہ تو چھٹی کو گناہِ کبیرہ سے بھی آگے کی کوئی شے سمجھتے تھے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ والد صاحب کی چھٹی ہو۔ سوائے سخت بیماری کے کوئی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو میں نے مشاہدات اور تجربات میں حضرت والد صاحب سے سیکھا اور پھر اپنا ذوق بن گیا ہے کہ چھٹی نہ ہو، تن آسانی نہ ہو۔ یہ میری کوشش ہوتی ہے اور میں الحمدللہ کامیاب بھی ہوتا ہوں اس کوشش میں۔ میرا خیال ہے کہ کوشش اور ارادہ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے، جب ارادہ ڈھیلا پڑ جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ تھا میرا تدریسی زندگی کا بیس سال کا معمول۔

پھر اس کے بعد کچھ مسائل اس نوعیت کے پیدا ہو گئے کہ تدریسی عمل میں 1990ء سے 1998ء تک آٹھ سال کا ناغہ پڑ گیا۔ پھر 1998ء میں حضرت صوفی صاحب (چچا محترم) نے فرمایا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ایک دو سبق پڑھا دیا کرو تو میں نے وہاں موطا امام مالک اور سنن نسائی پڑھانا شروع کی۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی معذوری کے بعد سے ترجمہ قرآن کریم، بخاری شریف، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق میرے پاس ہوتے تھے۔

اس دوران جو باتیں میں نے محسوس کی ہیں وہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ والد محترم کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے بخاری شریف میرے خیال سے چالیس بار سے زیادہ مرتبہ پڑھائی ہوگی، لیکن اس کے باوجود آخری دور میں بھی ان کو دیکھا ہے کہ رات کو مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دو چار مرتبہ پڑھا کر ایک کتاب سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یار پڑھائی ہوئی ہے، کوئی مسئلہ نہیں، پڑھا لیں گے۔ صبح دیکھی جائے گی، کیا ہوتا ہے۔ لیکن والد محترم مطالعہ لازمی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور بخاری شریف کا حاشیہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مطالعے کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے لگے کہ میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ جتنی دفعہ دیکھا ہے، کوئی نیا نکتہ سامنے آیا ہے، کوئی نہ کوئی نئی بات ذہن میں آئی ہے۔

الحمدللہ! میرا ذوق بھی یہی ہے کہ حتی الوسع ان روایات کو نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں عرض کررہا تھا کہ ایک تو وہ سبق کے ناغے کو گناہ سمجھتے تھے، دوسری بات مطالعے کے بغیر سبق پڑھانے کو بھی وہ تقریباً گناہ ہی سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں جتنا اہتمام میں نے ان کا دیکھا ہے، حیران کن ہے۔

تیسری بات جو ہم نے ان میں دیکھی وہ ہے وقت کی پابندی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چھ بجے کے بجائے چھ بج کر ایک منٹ پر آئیں۔ پانچ بج کر انسٹھ منٹ ہو سکتے ہیں لیکن، چھ بج کر ایک منٹ نہیں ہوسکتا۔ بارہا میں نے تجربہ کیا ہے۔ ہمارے علاقے میں دو آدمیوں کے بارے میں یہ محاورہ مشہور تھا کہ ان کو دیکھ کر لوگ گھڑیاں درست کرتے ہیں۔ ایک مولانا ظفر علی خان جو کہ وزیر آباد کے تھے، ان کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولانا ظفر علی خان کی سرگرمیاں دیکھ کر ہم گھڑی درست کرتے ہیں اور کہتے تھے کہ گھڑی غلط ہوسکتی ہے لیکن ظفر علی خان غلط نہیں ہو سکتے اور دوسرے ہیں والد مرحوم۔ جو وقت کہا ہے اسی وقت پر پہنچنا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خود وقت سے آگے پیچھے ہو جائیں یا کسی اور کو ہونے دیں۔

میں ان کے تجربات اور اپنے مشاہدات وتاثرات عرض کررہا ہوں۔ والد صاحب کا ایک معمول اور بھی تھا جو میں اپنے اساتذہ بھائیوں سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ پرانے بزرگوں کی جو بات ہم نے دیکھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مدرسے کی کوئی چیز مدرسے کے کام کے علاوہ کہیں اور استعمال ہو سکے۔ تقریباً ربع صدی تک ان کا معمول رہا ہے کہ گکھڑ سے گوجرانوالہ ٹرین یا بس پر آتے تھے۔ ایک میل چلنا، پھر گاڑی میں بیٹھنا، پھر گاڑی سے اتر کر آگے ایک میل پیدل چلنا، تقریباً تیس سال یہ معمول رہا۔ آخری عمر میں مدرسہ والوں نے فیصلہ کیا کہ گاڑی لے لیتے ہیں جو گھر سے لے آیا کرے اور شام کو گھر چھوڑ آیا کرے۔ گکھڑ سے گوجرانوالہ جاتے وقت گاڑی میں جگہ ہوتی تو ہم بھی ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ گاڑی جی ٹی روڈ پر گوندلانوالہ چوک سے گھنٹہ گھر کی طرف مڑ جاتی تھی جبکہ میرا جی ٹی روڈ پر اس سے اگلا سٹاپ شیرانوالہ باغ ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے چوک پر ہی اتار دیتے کہ یہاں اتر جاؤ۔ یہ آپ کے ابا کی نہیں، مدرسے کی گاڑی ہے۔ اہلیہ اور بچے ساتھ ہوتے، تب بھی اتار دیتے تھے کہ یہاں سے رکشے میں بیٹھ کر جائیں۔

ایک بات اور میں نے دیکھی والد صاحب کے طریق تدریس میں۔ والد صاحب سے زیادہ فقہی مباحث کون کرتا ہوگا؟، اعتقادی مباحث، فقہی مباحث اور شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور حنفیہ کی اختلافی بحثیں ان سے زیادہ کون کرتا ہوگا، لیکن ایسا وہ صرف ایک کتاب میں کرتے تھے۔ ساری بحثیں صرف ترمذی میں کرتے اور بخاری شریف اتنی سادہ پڑھاتے تھے کہ آپ اس سے زیادہ سادگی کا تصور نہیں کر سکتے۔ ترجمۃ الباب، ایک آدھ مسئلہ اور اگر کوئی متعلقہ بات ہو تو کہہ دیتے تھے ورنہ آگے بڑھ جاتے اور کہتے تھے کہ حدیث کو حدیث کے طور پر پڑھو، بطور خاص بخاری شریف کو، مباحث کسی اور کتاب میں کر لیں۔ ان کا ایک دورانیہ طے ہوتا تھا، پورے سال کا ایک توازن ہوتا تھا، ایک

ترتیب اور متعین مقدار کے حساب سے چلتے تھے اور الحمدللہ میرا ذوق بھی کچھ تھوڑا بہت یہی ہے۔ میں تو ویسے بھی جھگڑے والا (یعنی فقہی اختلافی مسائل میں پڑنے والا) آدمی نہیں ہوں، تطبیق وتوفیق کی دنیا کا آدمی ہوں، لیکن پھر بھی اختلافی بحثیں ضرورت کے مطابق کرتا ہوں۔ چونکہ بخاری شریف اور طحاوی دونوں میرے پاس ہوتی ہیں، اس لیے جب سال کے شروع میں اسباق کا آغاز ہوتا ہے تو میں طلبہ سے ایک بات کہہ دیا کرتا ہوں کہ جھگڑے سارے طحاوی میں کریں گے اور تسلی سے کریں گے۔ بخاری میں میری جانب سے آپ کو صرف تین باتیں ملیں گی: نفس حدیث، ترجمۃ الباب سے تعلق اور آج کا کوئی مسئلہ اس سے متعلق ہے تو وہ۔ بس! اس سے زیادہ آپ کو بخاری میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات میں پہلے دن سے ہی بتا دیتا ہوں کہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آپ نفس حدیث سمجھ جائیں اور حالات حاضرہ پر اس کی تطبیق سمجھ لیں۔

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں تو سارا وقت لگ جاتا ہے چند ابواب پر، پھر باقی کتاب سے ایسے گزرتے ہیں جیسے گزر رہی گئے ہیں۔ طلبہ کو اکثر ابواب کا نفس مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا اور اب اکثر جگہوں پر یہ عادت سی بن گئی ہے۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ پہلی سہ ماہی تک استاد بھی سمجھتا ہے اور شاگرد بھی، دوسری سہ ماہی میں استاد سمجھتا ہے لیکن شاگرد نہیں سمجھتا، اور ششماہی کے بعد نہ استاد سمجھتا ہے اور نہ شاگرد۔ یعنی نہ اُستاد کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھا رہا ہوں اور نہ شاگرد کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ والد صاحب اس پر ناراض ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غیر ضروری بحث میں نہ پڑیں، نصاب کی کتاب پوری پڑھائیں اور اچھے طریقے سے پڑھائیں۔ بحثیں دوسری کتابوں میں کرلیں، یہاں نفس حدیث پڑھا دیں اور اگر کوئی متعلقہ بات ہے تو وہ کر دیں۔

ایک طالب علمانہ بات میں کہنا چاہوں گا کہ بخاری شریف کا جو مکمل نام ہے یعنی ''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ'' اس نام کے پہلے لفظ یعنی ''الجامع م'' کا ترجمہ جو ہمارے متقدمین کرتے آئے ہیں، وہ درست ہے کہ یہ تمام علوم کی جامع کتاب ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی لکھا ہے، لیکن ایک طالب علمانہ ترجمہ میں بھی کیا کرتا ہوں۔ الجامع کا ترجمہ آج کے حوالے سے یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام جامع دین ہے، مکمل نظام حیات اور دستوری زندگی ہے، زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ان کو آنکھوں سے دیکھنا ہو تو بخاری شریف کی فہرست پڑھ لیں۔ ایک نظر ڈالنے سے اسلام کی جامعیت آپ کے سامنے آجائے گی۔ ایک دفعہ نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ زندگی کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جسے ٹچ نہیں کیا گیا؟!، جس کے بارے میں حدیث یا قرآنی آیت نہ دی ہو۔ معاشرے کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والا کون سا مسئلہ ہے جو اس میں نہیں ہے۔ میں اس ''الجامع'' کا یہ ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ اسلام کی جامعیت کا اظہار بخاری شریف

میں ہے۔طلبہ کو بخاری اس انداز سے پڑھانی چاہیے کہ طلبہ کے سامنے کم ازکم اسلام کے اجتماعی نظام کا ایک تصور اور خاکہ آجائے اور انہیں معلوم ہوجائے کہ اسلام میں کیا کچھ ہے۔معاملات اور زندگی کے متعلقہ شعبوں کے ابواب تو ہمارے سامنے سے ایسے ہی گزر جاتے ہیں، حالانکہ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہ کو آج کے عالمی تناظر اور عالمی ماحول میں ایک سسٹم اور نظام زندگی کے طور پر طلبہ کو پڑھائیں تاکہ آنے والا دور جو کہ فکری لحاظ سے پریشان کن ہے، اس دور میں ہمارے طلبہ اسلام کی صحیح نمائندگی کرسکیں۔

ایک اور تجربہ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں جس کے لیے ایک واقعہ عرض کروں گا جس میں سوچنے کا پہلو ہے۔ ہمارے زمانے میں تحریری امتحان نہیں ہوا کرتا تھا، زبانی امتحان ہوتا تھا۔1970ء میں ہمارا بخاری شریف کا امتحان ہورہا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ ہوتے تھے حضرت مولانا بشیر احمد پسروری، بڑے عالم دین تھے، وہ امتحان لینے آئے۔ چودہ طلبہ کی کلاس تھی۔ان کی ایک بات بہت پسند آئی۔ہمیں بٹھایا اور کہا کہ فلاں صفحہ کھولیں اور یہ عبارت پڑھیں۔بلوچستان کے مولانا شمس الدین شہید آپ کے ذہن میں ہوں گے، وہ میرے دورے کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کی عبارت پڑھی۔ پھر مولانا پسروری نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کے مباحث نہیں پوچھوں گا کہ اس میں مسئلہ کیا بیان ہوا ہے اور یہ کہ شوافع وحنابلہ اس مسئلہ پر کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہ سب تم نے رٹا ہوا ہے۔ میرا سوال تم سے یہ ہے کہ یہ حدیث آپ کو پنجاب کے دور دراز گاؤں میں اَن پڑھ لوگوں کے سامنے بیان کرنی ہے، کیسے کروگے، ان کو یہ حدیث کیسے سمجھاؤ گے؟ طلبہ میں مجھ سے سینئر لوگ موجود تھے، لیکن وہاں میرا داؤ لگ گیا۔ میں نے کہا، حضرت میں یہ کروں گا۔ پھر میں نے ٹھیٹھ پنجابی میں اس حدیث پر سات منٹ تقریر کی اور اعلیٰ نمبروں کا مستحق ٹھہرا، حالانکہ کلاس میں مجھ سے زیادہ لائق حضرات موجود تھے۔یعنی یہ بھی ضروریات میں سے ہے کہ دیہاتی اور اَن پڑھ لوگوں کے سامنے ان کے لہجے اور ضرورت کے مطابق قرآن و حدیث پہنچانے کا فن آتا ہو، کیونکہ درس گاہ میں کیے جانے والے مباحث میں اور عوام کے سامنے قرآن وحدیث پیش کرنے میں بہت فرق ہے۔

اس پر بھی مجھے ایک لطیفہ کی بات یاد آگئی۔ میرے بزرگ پھوپھی زاد بھائی تھے، فوت ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین۔ میں چھوٹا طالب علم تھا، وہ ذرا سینئر تھے۔ وہ کہیں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ایک دن وہ مجھے ساتھ لے گئے اور جمعہ پڑھانے کے بعد مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نے کیسی تقریر کی ہے؟ میں نے کہا، بیڑا غرق کردیا ہے۔ کہتے ہیں میں ساری رات تقریر رٹتا رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ آپ نے

یہ کیا ہے کہ کل مولانا قاضی محمد اسلم سے ملّا حسن کا جو سبق پڑھا تھا، وہ آج جمعہ کے خطبہ میں دہرا دیا ہے کہ یہ لا بشرط شئ ہے اور یہ بشرط شئ ہے، بشرط لا شئ ہے۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے اور یہ قضیہ سالبہ ہے۔ ان غریبوں کو کیا پتہ کہ قضیہ شرطیہ کیا ہوتا ہے اور بشرط شئ کیا ہوتا ہے؟۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ طلبہ میں یہ ذوق پیدا کریں کہ وہ عام لوگوں سے بھی بات کر سکیں۔ اس کو فریکونسی سیٹ کرنا کہتے ہیں۔ ہماری آپس کی فریکوینسی تو سیٹ ہوتی ہے، لیکن پبلک کے ساتھ ہماری فریکونسی سیٹ نہیں ہوتی۔ میں اپنا چالیس پینتالیس سال کا تجربہ آپ سے ذکر کرتا ہوں کہ ہم عام لوگوں کے ذہن کے مطابق بات نہیں کرتے جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی نمازیوں کے ساتھ، متعلقین کے ساتھ جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے پچانوے فیصد ایسے ہیں جو فریکونسی سیٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہم کسی اور لہجے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اور وہ کسی اور لہجے میں کر رہا ہوتا ہے، جبکہ بات دونوں ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ہم باہمی اتفاق نہیں کر پاتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں اور تلامذہ میں اس بات کا ذوق پیدا کریں کہ وہ عام آدمی سے ان کے لہجے میں بات کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے الفوز الکبیر میں یہ بحث کی ہے کہ عام انسان سے بات کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عام انداز استعمال کیا ہے اور عام آدمی کی نفسیات کے مطابق بات کی ہے۔ مکھیوں، مچھروں اور مکڑی کی مثالوں سے بات کی ہے، یعنی عام آدمی کی ذہنی سطح کا لحاظ کر کے بات کی ہے۔ ہمیں بھی عام آدمی کے لیول پر آنا سیکھنا چاہیے اور اپنے شاگردوں کو سکھانا چاہیے۔ آج کے حالات میں یہ بہت زیادہ ضروری ہے، آج کی صورتحال کیا ہے، میں بطور ایک امام اور مدرس کے بات کر رہا ہوں کہ اس بات کی تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے جو ہم نہیں کر رہے۔

آج سے پچاس سال پہلے لوگوں کے لیے دین کی معلومات کا ذریعہ صرف ہم ہوتے تھے۔ جو معلومات ہم نے دے دیں اور جو فیصلہ ہم نے کر دیا، وہی اس فرد کی معلومات اور فیصلہ ہے۔ اب عام آدمی کے پاس ہمارے علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ جو نوجوان رات کو انٹرنیٹ پر بیٹھتا ہے، وہ صرف ہم پر انحصار نہیں کرتا کہ مولوی صاحب نے کیا بتایا ہے، بلکہ وہ تلاش کرتا ہے کہ متعلقہ آیتیں اور حدیثیں کون کون سی ہیں۔ آج اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے عام آدمی میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز نہ کیجیے۔ پہلے عام آدمی کے پاس دین کی معلومات کے لیے واحد ذریعہ ہم تھے، اب صورتحال یہ ہے کہ اس کے پاس ہمارے علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اخبارات ہیں، میگزین ہیں، ٹی وی چینل

ہیں، انٹرنیٹ ہے۔تو جب وہ ہم سے بات کرتا ہے تو وہ صرف ہماری معلومات پر بنیاد رکھ کر بات نہیں کرتا بلکہ وسیع معلومات کی بنیاد پر سوال کرتا ہے، اس لیے جب ہم اسے محدود دائرے میں رہ کر جواب دیتے ہیں تو اسے وہ جواب مطمئن نہیں کر پاتا۔ یہ تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے۔ رات کو اس نے چینل دیکھا، پروگرام میں کسی دانشور نے کوئی بات کر دی تو اس نے آ کر مجھ سے پوچھنا ہے کہ مولوی صاحب فلاں نے یہ بات کہی تھی۔ اس پر میرا رویہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو میں ڈانٹ دیتا ہوں کہ فضول پروگرام مت دیکھا کرو۔ اب وہ میرے کہنے سے تو باز نہیں آئے گا، دوسری رات وہ دو پروگرام مزید دیکھے گا اور پھر مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آ جائے گا۔ اب جبکہ میرے پاس اس حوالے سے معلومات مکمل نہیں تو میں یہ کہنا توہین سمجھتا ہوں کہ بیٹا کل میں تیاری کر کے بتاؤں گا۔ میں اسے ادھورا سا جواب دوں گا اور ساتھ ڈانٹ دوں گا، بہرصورت وہ کنفیوژ ہوگا۔ اس کا نتیجہ جو نکلے گا، وہ میرے نزدیک آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ مولوی کا علمی مقام اور اس کی دینی ثقاہت سوسائٹی میں مجروح ہوگی اور ہو رہی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کو تو دین کا کچھ پتہ نہیں ہے اور یہی حال عام معلومات کا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بطور خطیب یا مدرس ہمیں اپنا جنرل نالج اور عمومی مطالعہ اس قدر بڑھانا ہوگا کہ ہم تمام متعلقہ معلومات کا احاطہ کر کے بات کو صحیح تناظر میں پیچان سکیں۔ ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کلاس میں طلبہ کو بتا سکیں کہ یہ صورتحال آج یوں ہے، کل یوں تھی، حالات میں یا مسئلہ میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے تاکہ انہیں یہ معلوم کرنے کیلئے کسی اور کے پاس نہ جانا پڑے۔ طالب علم کو وہ بتائیں جو اس کی ضرورت ہے، لیکن خود اپنے مطالعے میں وسعت اور تنوع پیدا کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ورنہ ہم نہ طالب علم کو مطمئن کر پائیں گے اور نہ بطور خطیب اپنے سننے والے کو اور اگر ہم مطمئن نہ کر پائے تو ہماری ثقاہت مجروح ہوگی اور اگر یہ مجروح ہوگی تو دین کو نقصان ہوگا۔

آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا۔ میں جب اپنی برادری (اساتذہ) سے بات کرتا ہوں تو دیوان حماسہ کا ایک شعر ضرور سنایا کرتا ہوں۔ دیوان حماسہ میں ایک شاعر کا ذکر ہے کہ وہ جوان ہوا، قبیلے والوں نے کھلایا پلایا، لیکن لڑنا نہیں سکھایا۔ دشمن داری تھی، لڑائی ہوئی تو مار کھائی۔ اس پر اب وہ قبیلے والوں کو کوس رہا ہے۔ کہتا ہے:

فهلا عدونی لمثلی تفاقدوا
ذ الخصم بزی مائل الرس نکبو
هلا عدونی لمثلی تفاقدوا
وفی الرض مبثوث شجاع وعقرب

اپنے قبیلے کو کوس رہا ہے کہ جب ان کو پتہ تھا کہ میری دشمن داری بڑے متکبر آدمی سے ہے تو انہوں نے مجھے تربیت

کیوں نہیں دی؟ جب انہیں پتہ تھا کہ زمین پر بچھو اور سانپ بکھرے پڑے ہیں تو مجھے بتایا کیوں نہیں، ان سے بچنے کا طریقہ کیوں نہیں سکھایا؟ اس میں اساتذہ کے لیے پیغام ہے کہ آج دنیا میں نظریاتی، ثقافتی، علمی اور فکری لحاظ سے شکوک وشبہات کا جو جنگل آباد ہے اور فکری انتشار، تہذیبی خلفشار اور ثقافتی یلغار کا جو دائرہ پھیل رہا ہے، اس سے اپنے طالب علم کو آگاہ کرنا، اس کو مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر میں بحیثیت استاد آج کے علمی ماحول اور اس کے خطرات کو محسوس نہیں کروں گا اور اپنے طلبہ کو مدرسہ سے باہر جانے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، اس سے آگاہ نہیں کروں گا تو وہ پھر میرے بارے میں یہی شعر دہرائے گا اور اسی لہجے میں مجھے کوسے گا۔ بس یہی میرا پیغام ہے اپنے لیے بھی، آپ کے لیے بھی۔ دنیا کے حالات کو محسوس کریں، علمی، فکری، ایمانی اور تہذیبی دنیا میں مستقبل کے خطرات کو محسوس کریں اور اپنے طلبہ کو اپنے نصاب کے دائرے میں ان سے آگاہ کریں۔ استاد سب کچھ کر لیتا ہے، استاد کے لیے کتاب نہیں بلکہ اس کا ذوق اہم ہے۔ کوئی بھی کتاب ہو، استاد کا فہم اصل اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آج ہماری ذمہ داری کیا ہے اور ہمارے زیر تعلیم جو پود ہے، اس کو مستقبل میں کیا صورت حال پیش آنے والی ہے، اس کے لیے میں نے انہیں کیسے تیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین!۔

(بقیہ: احسان اور تصوف)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا اثر یہ تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ منورہ میں داخل ہوتے تھے تو ہر چیز روشن معلوم ہوتی تھی۔ جب تک آپ رہے مجھے سب چیزیں روشن معلوم ہوتی رہیں۔ وفات کے بعد جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر مٹی ڈالی تو وہ روشنی جاتی رہی اور کہتے ہیں کہ ابھی ہم نے ہاتھوں سے مٹی نہیں جھاڑی تھی کہ خود ہمیں اپنے دل اَو پرے معلوم ہونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کے آفتاب تھے۔ صحابہ کرام نے اُن سے روشنی حاصل کی، اسی بنا پر اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو شخص اسلام کے ساتھ چند منٹ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں رہا ہو وہ بعد کے آنے والے بڑے سے بڑے متقی اور ولی سے بھی افضل واعلیٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت بجلی سے بھی زیادہ طاقتور تھی دل ودماغ روشن کرنے والی، اس لئے ریاضت کی زیادہ حاجت نہ ہوتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اخلاص کے ساتھ مجلس میں حاضری ہو جائے۔ مگر جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کی جدائی کے بعد وہ روشنی نہیں رہی، اسی طرح صحابہ کرام کے زمانہ سے جتنا زمانہ دور ہوتا گیا روحانی اور قلبی صفائی میں کمی ہوتی گئی۔ جس طرح صاف برتن کے صاف کرنے سے میل جلد دور ہو جاتا ہے۔ عہد صحابہ کے صاف قلوب کو صاف کرنے کے لئے کسی خاص ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر جیسے جیسے میل بڑھتا اور جمتا گیا، ریاضت کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ (باقی آئندہ)

شعبہ تحفیظ مضبوط کرنے کے چند آزمودہ طریقے

ابن الحقانی

شعبہ تحفیظ جہاں فضیلتوں کا بحر بے کنار ہے وہیں آزمائشوں اور کمر توڑ ذمہ داریوں سے بھی بھرپور ہے، جسے کامل طریقے سے نبھانا واقعتا بہت ہی مشکل ہے۔ بہت سے ایسے احباب جو اس میدان میں نو وارد ہیں انہیں جب کمزور کلاس حوالے کی جاتی ہے تب وہ پریشان ہوتے ہیں۔ میرے کچھ ہم درس دوستوں اور ساتھیوں نے اس بابت استفسار کیے ہیں سو مختصراً عرض ہے کہ چند امور کا لحاظ رکھیں ان شاءاللہ درسگاہ بہت جلد آپ کی گرفت میں ہوگی:

بنیادی کام درسگاہ کا ماحول: اوّلاً کلاس کا ماحول بنائیں، طلبہ کی ذہن سازی کریں کہ وہ توجہ سے نیچے دیکھ کر درمیانی آواز سے پڑھیں، غفلت برتنے سے اور دائیں بائیں دیکھنے سے گریز کریں باہمی گفت وشنید درسگاہ میں بالکل نہ کریں، درسگاہ کا سازگار ماحول بنیادی شرط ہے، اسکے بغیر طلبہ کو ترقی کی طرف لے جانا مشکل ہے۔

منزل کی کیفیت معلوم کرنے کا طریقہ: دو چار دن طلبہ کو آزمائیں کہ وہ کتنی منزل سنا سکتے ہیں؟ مثلاً انہیں پہلے دن کہیں کہ دو پارے منزل یاد کر کے آئیں۔ اگر کمزور درسگاہ ہے تو بہت مشکل ہے کوئی دو پارہ درست سنائے مگر اس سنانے سے آپ کو منزل کی کیفیت کا اندازہ ہوجائے گا کہ کمزوری کس قدر ہے دوسرے دن ایک پارہ سنانے کا کہیں اور یاد کرنے کی ترغیب بھی دیں اگر باوجود محنت کرنے کے بچہ ایک پارہ بھی نہیں سنا پارہا یا ایک پارے میں بے تحاشا اٹکن کرتا ہے اور چار پانچ تک اغلاط بھی ہیں تو سمجھ جائیں کہ بچے کی منزل کیفیت کے اعتبار سے زیرو ہے۔

منزل یاد کرانے کا طریقہ: ایک پاؤ کی ترتیب شروع کریں کہ ہر طالب علم ایک پاؤ سنائے گا، غنے، مد اور رفتار کا لحاظ اس قدر رکھوائیں کہ گویا یہ سبق سنا جارہا ہے۔ غلطی آنے پر واپس کردیں، ایک سے دو اٹکن کی گنجائش رکھیں۔ جب دوسرے دن دوسرا پاؤ سنائے تو آدھا پارہ یہی منزل سنیں۔ جب پارہ مکمل ہوجائے اسے جائزہ پارہ شمار کریں، سن کر جائزہ دلوائیں۔ اس دن اگر پاؤ کی چھٹی ہوجاتی ہے تو کوئی بات نہیں، یوں ایک ماہ میں کم از کم پانچ پارے بہترین ہوجائینگے۔

روز کی منزل: روزانہ انہیں پاروں میں سے دو پارے منزل سنیں مگر معیار وہی رکھیں کہ غلطی نہ آنے پائے، البتہ

تین چار اٹکن تک رخصت دیں، ہر پانچ پاروں پر پہنچ کر تمام پارے سماعت کریں اور جائزہ دلوائیں۔ ''سبق'' اگر بچہ سبق مذکورہ ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنا سکتا ہے تو ضرور سنیں بلکہ کوشش کریں کہ سبق بالکل بند نہ کریں۔ اگر چاہیں دس پاروں کے بعد کچھ پاروں تک بند کریں مگر اس کی مدت طویل نہ کریں۔ زیادہ مشقت ہو رہی ہو تو سبق کم کر دیں اور مغرب کے بعد سنانے کی ترغیب دیں، البتہ پانچ چھ پاروں تک کی منزل ہو تو سبق بند کرنے میں حرج نہیں۔

سبق کا معیار: سبق میں کمزوری بالکل برداشت نہ کریں، بغیر کسی اٹکن کے سننے کو رواج دیں۔

سبقی کا معیار: جب سبق آپ نے مضبوط سنا تب سبقی میں کوئی دقت نہیں رہتی۔ اس میں دو اٹکن تک کی رخصت رکھیں۔ معیار ذہین طلبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعین کریں مگر کمزور طلباء کو غیر شعوری طور پر کچھ چھوٹ دیں تاکہ وہ کوشش پوری کریں۔ مثلاً سبق کا معیار رکھیں کہ بغیر اٹکن کے سبق ہونا چاہیے مگر کمزور طالب علم کی ایک آدھ اٹکن سے درگزر کریں۔

چند عمومی باتیں: بچوں کی سماعت پر کلی اعتماد نہ کریں بلکہ منزل سنانے کے وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر ہر بچے کے پاس جا کر کچھ نہ کچھ سنیں۔ روزانہ دو چار بچوں سے منزل کا جائزہ لیں تاکہ سب ہوشیار رہیں اور اچھے سے سننے سنانے کا عمل جاری رہے۔ منزل یاد کرتے وقت بار بار انہیں متنبہ کرتے رہیں کہ اچھے سے یاد کریں غفلت میں نہ پڑنے دیں۔ بچوں کو معیارات مکمل نبھانے پر انعامات سے نوازیں، تعریفی کلمات کہیں۔ روزانہ کی سطح پر ضرور ترغیبی گفتگو کریں اس سے طلباء میں محنت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

کچھ نہ کچھ سختی لازمی ہے۔ ہر بچے کا مزاج مختلف ہوتا ہے کچھ پیار سے تو کچھ مار سے چلتے ہیں، دونوں میں اعتدال سے کام لیں۔ طلبہ کو درود شریف کا وظیفہ بتائیں، ترغیب دیں، پوچھتے رہیں، پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

ٹچ موبائل سے طلبہ کو بہت دُور رکھیں۔

اگر ان امور کی آپ نے پاسداری کی تو میں یقین سے کہتا ہوں آپ کی درسگاہ میں حافظ بننے والے بچے کو گردان کی ضرورت نہیں ہوگی اور وہ ایک ہی دن میں مکمل قرآن سنانے لائق ہوگا۔

نوٹ! بندہ شروع ہی سے کتب کی تدریس کے ساتھ ساتھ شعبہ تحفیظ سے وابستگی رکھتا ہے یہ تمام امور آزمودہ ہیں اور اسی ترتیب پر ہم اپنی درسگاہ چلاتے آرہے ہیں۔

تشہد میں حلقہ بنا کر انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کا ثبوت

مفتی ابوالخیر عارف محمود گلگتی کشمیری
دارالافتاء مدرسہ فاروقیہ کشروٹ گلگت

نماز میں تشہد پڑھتے ہوئے انگلی اٹھانا اور اشارہ کرنا متعدد شرعی نصوص سے ثابت ہے، علامہ عابد سندھی رحمہ اللہ نے طوالع الانوار شرح درمختار میں لکھا ہے کہ تشہد میں انگلی اٹھانے سے متعلق ستائیس اٹھائیس صحابہ سے روایات مروی ہیں۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے بھی اپنے رسالہ ''تزئین العبارۃ بتحسین الإشارۃ'' میں ایسا ہی لکھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس پر امت کا تسلسل کے ساتھ عمل چلا آرہا ہے، حدیث اور فقہ کی تقریباً ہر کتاب میں اس کا ثبوت اور سنت ہونا واضح طور پر لکھا ہوا ہے، چناں چہ تشہد پڑھتے وقت دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کا حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا اور انگلی کو جھکا دینا اور آخر تک حلقہ قائم رکھنا سنت ہے۔

ذیل میں طوالت سے بچتے ہوئے اس حوالہ سے چند احادیث کا تذکرہ کیا جائے گا تاکہ اس عمل کی حقیقت سامنے آجائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت:

1۔عن ابن عمر۔رضي الله عنهما۔أن رسول الله۔صلى الله عليه وسلم۔كان إذا قعد في التشهد وضع يده اليسرى على ركبته اليسرى، ووضع يده اليمنى على ركبته اليمنى، وعقد ثلاثة وخمسين (1)، وأشار بالسبابة. رواه مسلم (2).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تھے تو اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن (53) کا عقد بنا کر شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے تھے۔ (امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے۔)

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت:

2. عن عامر بن عبد الله بن الزبير عن أبيه رضي الله عنهما۔قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا

قعد يدعو، وضع يده اليمنى على فخذه اليمنى ويده اليسرى على فخذه اليسرى، وأشار بإصبعه السبابة(3)، ووضع إبهامه على إصبعه الوسطى، ويلقم كفه اليسرى ركبته. رواه مسلم(4).

ترجمہ: عامر بن عبداللہ کی اپنے والد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعائے تشہد کے لیے قعدہ فرماتے تو اپنے داہنے ہاتھ کو داہنی ران پر، اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھتے، اور انگشت شہادت سے اشارہ فرماتے، اور اپنا انگوٹھا بیچ والی انگلی پر رکھتے، اور بائیں ہتھیلی کو بایاں گھٹنہ پکڑاتے۔

امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے۔

فائدہ: بعض روایات میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کا ذکر ہے، اور بعض میں رانوں پر رکھنے کا ذکر ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں اور ران کے ملتقے اور جوڑ پر رکھتے تھے، چنانچہ بعض روایات میں یکجا گھٹنہ اور ران دونوں پر رکھنا بھی مذکور ہے، چناں چہ اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ قعدہ میں انگلیاں رکھنے کا افضل اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کو ران پر اس طرح رکھیں کہ گھٹنے کی ابتدا تک انگلیاں آجائیں اور ان کا رخ قبلہ کی جانب ہوجائے، انگلیوں سے گھٹنوں کو اس طرح نہیں پکڑیں گے کہ ان کا رخ زمین کی طرف ہوجائے۔ (دیکھیے: البحر الرائق: 1/342، ط: سعید)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت:

3. عن وائل بن حجر - رضي الله عنه - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - جلس فوضع يده اليسرى على فخذه اليسرى ومرفقه اليمنى على فخذه اليمنى، ثم عقد الخنصر والبنصر، ثم حلق الوسطى بالإبهام، وأشار بالسبابة. رواه البيهقي (5). وقال النووي: إسناده صحيح (6).

ترجمہ: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشہد میں تشریف فرما ہوئے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے دائیں ران پر رکھا اور بایاں بازو بائیں ران پر رکھا، پھر بیچ والی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ یعنی دائرہ بنایا اور شہادت کی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

امام بیہقی نے اسے روایت کیا ہے۔ امام نووی نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ زبیر رضی اللہ عنہما کی فیصلہ کن روایت:

4. عن عبد الله بن الزبير - رضي الله عنهما - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - كان يشير بأصبعه إذا دعا، ولا يحركها. رواه أبو داود (7)، والنسائي، واللفظ له (8). وقال النووي: إسناده صحيح (9). وقال ابن

المُلقن: ہذا الحدیث صحیح (10)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعائے تشہد میں اپنی انگلی سے اشارہ فرماتے اور اسے حرکت نہیں دیا کرتے تھے، یعنی ہلاتے نہیں رہتے تھے۔

اسے امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور یہ امام نسائی کے الفاظ ہیں۔ امام نووی نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ امام ابن المُلقن نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

فائدہ: روایات میں تطبیق:

امام بیہقی نے انگلی کو اشارہ دینے سے متعلق حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

يحتمل أن يكون مراده بالتحريك الإشارة لا تكرير تحريكها، فيكون موافقا لرواية ابن الزبير، والله تعالى أعلم (11)۔

یعنی اس حدیث میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ انگلی کو حرکت دینے سے ان کی مراد اشارہ کرنا ہو نہ کہ حرکت دیتے رہنا، چناں چہ اس احتمال کو مراد لینے سے ان کی یہ روایت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا روایت کے موافق ہو جائے گی۔

علامہ مبارک پوری کا قول:

فهذا الحديث يدل صراحة على عدم التحريك، وهو قول أبي حنيفة (12)۔

یہ حدیث یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا روایت صراحت کے ساتھ عدم تحریک یعنی انگلی نہ ہلاتے رہنے پر دلالت کر رہی ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

خلاصہ وحاصل:

جمہور علمائے احناف کے نزدیک ان احادیث کی روشنی میں اس بارے میں صحیح اور مختار قول یہ ہے کہ نمازی جب تشہد میں بیٹھے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے پھر تشہد پڑھنا شروع کرے، جب کلمہ توحید پر پہنچے تو دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کا حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور شہادت کی انگلی کو جھکا دے اور آخر تک حلقہ قائم رکھے، اس لیے کہ اس موقعہ پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کے حلقہ بنانا بالاتفاق ثابت ہے اور اس کیفیت کو بدلنے کا کوئی حکم موجود نہیں، چناں چہ اصل اور قاعدہ یہ ہے کہ چیز کو اس کی اسی اصل حالت پر باقی رکھا جائے۔ (13)

تنبیہ: واضح رہے کہ تشہد میں انگلی اٹھانا سنت ہے، فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ''لا الٰہ'' پر شہادت کی انگلی اٹھائی جائے اور ''الا اللہ'' پر رکھ دی جائے۔ یعنی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشہد کے وقت شہادت کی انگلی اٹھانے کا تذکرہ ہے، لیکن ''لا الٰہ'' پر انگلی اٹھانے اور ''الا اللہ'' پر نیچے رکھنے کی اگرچہ صراحت احادیث میں نہیں، لیکن یہیں احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کلمہ توحید پہ اشارہ سے توحید کا عملی اظہار مقصود ہے، چناں چہ فقہاء نے اس کو ذکر کیا ہے اور وجہ یہ لکھی ہے کہ انگلی کا اٹھانا نفی کا اشارہ ہے اس لئے ''لا الٰہ'' جو کہ (اللہ تعالیٰ کے ماسوا سب سے الوہیت کی) قولی نفی ہے تو اس کے ساتھ ہی انگلی اٹھانی چاہیئے تاکہ قولی نفی اور فعلی نفی دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو جائیں، جبکہ انگلی کا رکھنا اثبات کا اشارہ ہے اور ''الا اللہ'' میں بھی (خالص اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے الوہیت کا) اثبات موجود ہے، چنانچہ ''الا اللہ'' پر انگلی رکھنے سے قولی اثبات اور فعلی اثبات دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو جائیں گے۔

حوالہ جات:

1۔ وقد استشكل كثير من الفضلاء هذا إذا عقد ثلاث وخمسين لا يلائم واحدة من الصفتين المذكورتين؛ فإن الخنصر لا بد أن تركب البنصر في هذا العقد، وقد أجاب عن هذا بعض الفضلاء بأن الثلاثة لها صفتان في هذا العقد: قديمة وهي التي ذكرت في حديث ابن عمر، تكون فيها الأصابع الثلاث مضمومة مع تحليق الإبهام مع الوسطى، وحديثة وهي المعروفة اليوم بين أهل الحساب والله أعلم. (زاد المعاد في هدي خير العباد، فصل في كيفية جلوسه وإشارته في التشهد: 274/1).

2۔ صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب صفة الجلوس في الصلاة وكيفية وضع اليدين على الفخذين: 408/1، رقم الحديث: 580.

3۔ والحكمة في الاشارة بها أن المعبود سبحانه وتعالى واحد، ليجمع في توحيده بين القول والفعل والاعتقاد.

4۔ صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب صفة الجلوس في الصلاة وكيفية وضع اليدين على الفخذين: 408/1، رقم الحديث: 579.

5۔ السنن الكبرى وفي ذيله الجوهر النقي، كتاب الصلاة، باب ما روي في تحليق الوسطى بالإبهام: 131/2، رقم الحديث: 2895. ومدار الحديث على عاصم بن كليب، عن أبيه ورواه جماعة عن عاصم كما قال البيهقي. وعاصم من فرسان مسلم.

6۔خلاصة الأحكام في مهمات السنن وقواعد الإسلام، كتاب مواضع الصلاة، باب كيفية وضع اليدين على الفخذين، والإشارة بالمسبحة وكيفيتها، وما ينوي بها، ولا يحركها: 427/1، 428، رقم الحديث: 1384.

7۔سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب الإشارة في التشهد: 374/1، رقم الحديث: 991.

8 ۔ سنن النسائي، كتاب صفة الصلاة، باب بسط اليسرى على الركبة: 37/3، رقم الحديث: 1270.

9۔خلاصة الأحكام في مهمات السنن وقواعد الإسلام، كتاب مواضع الصلاة، باب كيفية وضع اليدين على الفخذين، والإشارة بالمسبحة وكيفيتها، وما ينوي بها، ولا يحركها: 428/1، رقم الحديث: 1390. وفي المجموع شرح المهذب، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مسائل تتعلق بالسجود: 454/3.

10۔البدر المنير في تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في الشرح الكبير، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، الحديث الخامس بعد المائة: 11/4.

11۔السنن الكبرى وفي ذيله الجوهر النقي، كتاب الصلاة، باب من روى أنه أشار بها ولم يحركها: 132/2، تحت رقم الحديث: 2899.

12۔تحفة الأحوذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الاشارة في التشهد: 160/2.

13۔راجع: شرح سنن أبي داود للعيني، كتاب الصلاة، باب في رفع اليدين: 311/3. ومرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الصلاة، باب التشهد، الفصل الأول: 442/3. وبدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الصلاة، فصل وأما سننها فكثيرة: 214/1. وحاشية رد المختار على الدر المختار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب في إطالة الركوع للجائي: 508/1، 509

عائلی قوانین اور ہماری عدالتیں

جناب محمد مشتاق احمد یار سنگ

انگریزوں نے جب برصغیر میں اپنا قانونی نظام رائج کیا، تو شروع محصولات کے قانون میں تبدیلیوں سے کی، پھر دیوانی قانون اور فوجداری قانون کی طرف توجہ کی۔ تاہم مسلمانوں کے عائلی قانون میں انھوں نے عمومی طور پر عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ ابتدا میں عائلی تنازعات کے فیصلے مسلمان قاضی ہی کرتے رہے؛ بعد میں ان قاضیوں کی جگہ جج مقرر کیے گئے، لیکن چونکہ انھیں اسلامی قانون کا علم نہیں تھا، تو ان کی معاونت کے لیے 'مفتی' مقرر کیے گئے؛ پھر کچھ عرصے بعد مسلمانوں کی اہم فقہی کتابوں کے انگریزی تراجم کیے گئے، تو مفتیوں پر انحصار بھی ختم ہو گیا۔

انگریزوں کے دور میں ججوں نے بطورِ اصول یہ طے کیا تھا کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ اپنا 'فہمِ شریعت' نافذ کرنے کے بجائے مقدمے کے فریقوں کے 'فقہی مذہب' کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ سنی مسلمانوں کے فیصلوں کے لیے 'ہدایہ' اور 'فتاویٰ عالمگیریہ'، اور اہلِ تشیع کے فیصلوں کے لیے 'شرائع الاسلام' میں حکم دیکھا جاتا۔ اگر فریقین کا تعلق الگ فقہی مذاہب سے ہوتا، تو پریوی کونسل نے فیصلہ دیا تھا کہ ایسے معاملے میں مدعا علیہ کے فقہی مذہب پر فیصلہ کیا جاتا۔ فقہی کتابوں کے تراجم میں بھی مسائل تھے اور بعض اوقات ان کتابوں میں مذکور قانونی اصولوں کے فہم میں ججوں سے بھی غلطیاں ہوئیں، لیکن عمومی طور پر وہ متعلقہ فقہی مذہب کی پابندی کی کوشش کرتے رہے، اور اس وجہ سے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوا، سوائے ان صورتوں کے جن میں ججوں نے اسلامی قانون کے کسی حکم کو اپنے 'تصورِ انصاف' کے خلاف سمجھ کر اسے موڑنے کی کوشش کی۔

'وقف علی الاولاد' کے متعلق پریوی کونسل کا فیصلہ اس کی ایک مثال ہے جس کے بعد قائدِ اعظم کی کوششوں سے 1913ء میں وقف ایکٹ نے مسلمانوں کے اوقاف کو تحفظ دیا۔ آزادی کے بعد اس صورتحال میں بہتری آنی چاہیے تھی، لیکن معاملہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ عائلی قوانین میں 'اصلاحات' کے لیے جو کمیشن قائم کیا گیا، اس میں صرف ایک عالم دین تھے اور دیگر ارکان کو اسلامی قانون کے مبادیات کا بھی علم نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس کمیشن کی رپورٹ آئی، تو اس پر علمی حلقوں کی جانب سے شدید تنقید ہوئی اور اسے سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ تاہم کچھ عرصے بعد

جنرل ایوب خان نے مارشل لا کے دوران 1961ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعے عائلی قوانین کے بعض امور میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کی کوئی بنیاد اسلامی قانون میں نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر 1967ء میں سپریم کورٹ کا مشہور فیصلہ 'خورشید بی بی بنام بابو محمد امین' آیا جس میں قرار دیا گیا کہ عدالت کے لیے فقہی مذاہب کی پابندی ضروری نہیں اور وہ براہِ راست قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے 'اجتہاد' کرسکتی ہے۔ اس کے بعد عدالتی فیصلوں میں براہِ راست قرآن وسنت کی تعبیر اور اجتہاد کے نام سے ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں" والی صورت بن گئی۔

تازہ ترین مثال یہ ہے کہ اسلام آباد ہائی کورٹ کے جسٹس محسن اختر کیانی نے 'عمارہ وقاص بنام وقاص رشید' مقدمے میں حکومت کو 'سفارش' کی کہ وہ باقاعدہ قانون سازی کے ذریعے شادی کے بعد بیوی کو شوہر کی جائیداد اور اثاثوں میں شریک قرار دے کر 'منصفانہ حصہ' دلوائے۔ فاضل جج نے اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ اسلامی قانون کے کسی ماہر یا ادارے سے معاونت حاصل کریں اور معلوم کریں کہ اس ضمن میں اسلامی قانون کے اصول کیا ہیں؟۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل جج نے فیصلے میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے شوہر اور بیوی الگ الگ قانونی شخصیت رکھتے ہیں اور شوہر کو بیوی کے مال پر، یا بیوی کو شوہر کے مال پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ انھوں نے شوہر پر بیوی کے حقِ مہر اور نفقہ کی ذمہ داری کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ کسی باقاعدہ معاہدے کی عدم موجودگی میں دونوں کے درمیان شراکت بھی فرض نہیں کی جاسکتی۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ قرار دے کر کہ ہر وہ چیز جائز ہے جس سے روکا نہیں گیا، حکومت کو یہ سفارش دے دی! جس اصول کا انھوں نے حوالہ دیا اس کا اطلاق "چیزوں" سے "فائدہ اٹھانے" پر ہوتا ہے، نہ کہ کسی شخص کے لیے "حق" یا "استحقاق" قائم کرنے پر، اور "چیزوں" پر بھی اس اصول کے اطلاق سے بہت ساری استثناءات ہیں۔

حیرت ہے کہ ملکیت اور شراکت کے متعلق اسلامی قانون کے واضح اصولوں کی موجودگی میں فاضل جج کیسے یہ کہہ سکتے تھے کہ اسلامی قانون بیوی کو شوہر کے مال میں شریک قرار دینے سے نہیں روکتا۔ کیا اسی طرح شوہر کو بیوی کے مال کا شریک مالک قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

بین الاقوامی معاہدات کی دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج نے یہ بات بھی نظر انداز کی کہ بین الاقوامی معاہدات کو پاکستان کی عدالتیں اس وقت تک نافذ نہیں کرسکتیں جب تک انھیں باقاعدہ قانون سازی کے ذریعے پاکستان کے قانون کا حصہ نہ بنایا جائے۔ انھوں نے اس پہلو سے بھی تجزیہ نہیں کیا کہ جن دیگر ممالک نے ایسی قانون سازی کی ہے کیا ان کا قانونی نظام ان اصولوں پر قائم ہے جو پاکستان کے قانونی نظام کی بنیاد ہیں؟۔

پاکستان اپنے آئین کی رو سے 'اسلامی جمہوریہ' ہے (دفعہ 1)؛ اس کا 'ریاستی مذہب' اسلام ہے (دفعہ 2)؛ یہاں کے نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ کائنات پر حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور پاکستان کے عوام کو عطا کردہ اختیارات ایک مقدس امانت ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنا ہے (دیباچہ اور دفعہ 2-اے)؛ یہاں رائج تمام قوانین کو اسلامی احکام سے ہم آہنگ کرنا اور ان قوانین سے تمام ایسے امور ختم کرنا لازم ہے جو اسلامی احکام سے متصادم ہوں (دفعہ 227)؛ یہاں آئین اور تمام قوانین کی ایسی تعبیر لازم ہے جو آئین اور قوانین کو اسلامی احکام سے ہم آہنگ کرے (قانونِ نفاذِ شریعت 1991ء، دفعہ 4 اور 'راجا عامر خان بنام وفاقِ پاکستان 2023ء' میں سپریم کورٹ کے فل کورٹ بنچ کا فیصلہ)؛ اور بالخصوص نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر 'شخصی امور' میں 'شریعت' ہی کو 'فیصلے کے قانون' کی حیثیت حاصل ہے (مسلم شخصی قانون (شریعت) کے نفاذ کا قانون، 1962ء، دفعہ 2)؛ نیز شخصی امور میں مختلف فرقوں کے فہمِ شریعت کو آئینی تحفظ حاصل ہے (آئین کی دفعہ 227 کی توضیح) اور وفاقی شرعی عدالت سمیت کوئی عدالت ان امور میں مداخلت نہیں کرسکتی ('ڈاکٹر محمود الرحمان فیصل' مقدمے، 1994ء، میں سپریم کورٹ کا فیصلہ)۔

ان اصولوں کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ججوں اور وکلا کو اسلامی احکام کی تفصیلی تعلیم دی جائے اور ججوں اور وکلا کی ٹریننگ میں اسلامی قانون اور اس کے اصولوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ ہمارے جج اگر براہِ راست قرآن و سنت کی تعبیر کرنا بھی چاہتے ہیں، تو اس کے لیے اسلامی قانون کے اصولوں میں مہارت ضروری ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ قانون کی تدریس کا نصاب وہی ہے جو انگریزوں کے دور سے چلا آرہا ہے۔

مدرسہ کے اساتذہ شریکِ کار ہیں، ملازم نہیں

''ہم سب اساتذہ وغیرہ کی مثال مشین کے پرزوں کی ہے، جس میں چھوٹے بڑے پرزے سب ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور ہم سب ایک کشتی کے مسافر ہیں اور اس کشتی کو کنارے تک پہنچانا ہم سب کا فرض ہے۔'' اساتذہ سے فرمایا: ''ہم سب ایک منزل کے مسافر ہیں اور ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، اپنی اپنی طاقت اور اخلاص کے مطابق اس کشتی کو منزل مقصود تک لے کر چلنا ہے، آپ حضرات میں سے کسی کو بھی یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا کوئی افسر ہے اور ہم اس کے ماتحت ہیں، ہمارے مدرسے کی بنیاد تقویٰ اور اخلاص پر قائم ہے۔''

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ

حضرت شیخ احمد شناوی رحمہ اللہ تعالیٰ

(۹۷۵-۱۰۲۸ھ/ ۱۵۶۸-۱۶۱۹ء)

مولانا جنید اشفاق اٹکی

برصغیر پاک و ہند میں تقریباً ہر حدیث کی سند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واسطے سے ہوتی ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے علمِ حدیث حجاز سے برصغیر منتقل کیا تھا۔ یہ اسناد مختلف مشائخ سے ہوتی ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں، ان اسناد میں آنے والی ہر ہر شخصیت علوم و معارف کی درخشاں تاریخ ہے۔ سیدی و سندی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بندہ کو حکم فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی سند میں آنے والے مشائخ کے کچھ احوال جمع کروں تاکہ اندازہ ہو کہ یہ شخصیات علوم و معارف کی کن بلندیوں پر فائز تھیں۔ الحمدللہ اس سلسلے کا چوتھا مضمون پیشِ خدمت ہے۔ یہ مضمون حضرت شاہ صاحبؒ کی صحیح بخاری کی سندِ حدیث میں آنے والی چوتھی شخصیت حضرت شیخ احمد شناویؒ کے بارے میں ہے۔ (جنید)

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا:

محبت کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں، محبّ، اپنے محبوب سے منسوب ہر ایک چیز کو سینے سے لگائے پھرتا ہے، محبوب کے گلی کوچوں سے محبت کرتا ہے حتیٰ کہ ان گلی کوچوں کا تذکرہ بھی دیوانِ محبت کا حصہ بن جاتا ہے، اسی محبت کی برکت ہے کہ کتنے ہی گمنام خطے شخصیات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ مکہ جیسے بے آب و گیاہ علاقے میں سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام قدم رنجہ فرماتے ہیں تو مکہ مبارک کہلاتا ہے، مدینہ طیبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد برکتوں کا منبع بنتا ہے۔ بارہا مبارک نفوس کے تذکرے فلسطین کے تذکروں کا باعث بن جاتے ہیں۔ ہم بخارا کو اس لیے جانتے ہیں کہ وہ امام بخاریؒ کا مسکن رہا ہے، ہمیں ترمذ کا تعارف اس لیے ہے کہ وہ امام ترمذیؒ کی طرف منسوب ہے، ہم بصرہ کا ذکر حضرت حسن بصریؒ کی نسبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ بغداد کا تذکرہ آنے پر ہمارے دل حضرت جنید بغدادیؒ کی وجہ سے دھڑکتے ہیں۔

قیس بن الملوح نے کہا تھا:

أمرّ على الديار ديار ليلى

أقبل ذا الجدار و ذا الجدار

وما حب الديار شغفن قلبي

و لكن حب من سكن الديارا

ترجمہ:

''میں لیلی کے گلی کوچوں سے گزرتا ہوں، کبھی اِس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اُس دیوار کو، ان گلی کوچوں کی محبت نے میرے دل کو فریفتہ نہیں کیا بلکہ اس شخص کی محبت نے کیا ہے جو ان میں رہائش پذیر ہے۔''

شیخ احمد شناویؒ بھی ان اولیاء کرام میں سے ہیں جن کے باعث مصر کی ''شِنُّو'' جیسی دورافتادہ بستی کے تذکرے زندہ ہیں۔

آپ کا سلسلہ نسب درج ذیل ہے:

أحمد بن علي بن عبد القدوس بن محمد المصري ثم المدني المعروف بالشناوي۔(۱)

آپ کی پیدائش شوال ۹۷۵ھ کو مغربی مصر کے محلہ روح میں ہوئی۔(۲)

تاج العروس کے مصنف محمّد مرتضى الحسيني الزَّبيديؒ شِنُّو کے لفظ کی تحقیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

شِنُّو: کسرہ اور نون مضمومہ کی تشدید کے ساتھ ہے، یہ مغربی مصر کی بستی ہے۔ محلہ روح میں مدفون، شیخ، قطب، محمد بن احمد بن عبداللہ بن عمر بن ہلال شناوی، صوفی، ولی، احمدی کا تعلق اسی بستی سے تھا۔ آپ سے حضرت شیخ شعرانیؒ اور دیگر حضرات نے استفادہ کیا تھا۔ مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کرنے والے شیخ، ابو العباس، احمد بن علی بن عبد القدوس بن محمد، جن سے شیخ قشاشیؒ نے بھی استفادہ فرمایا تھا، آپ کے پڑپوتے ہیں۔ صلاح، تصوف اور ولایت اس گھرانے کا خاصہ رہا ہے۔(۳)

حضرت شیخ احمد شناویؒ مشہور صوفی بزرگ، ولی کامل، شیخ محمد بن احمد شناویؒ کی نسل میں سے ہیں۔ شیخ محمد

---

(۱)معجم المولفين ج:۲ ص:۱۲

(۲)خلاصة الأثر فی قرن الحادی عشر ج:۱ ص:۲۴۶

(۳)تاج العروس (ش ن و)

شناویؒ، حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کے اساتذہ ومشائخ میں شامل ہیں۔

حضرت شیخ عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب" الطبقات الوسطیٰ" (لواقح الأنوار القدسية فی مناقب العلماء الصوفية) میں آپ کے حالات تفصیل سے نقل فرمائے ہیں۔ چند سطور نقل کی جاتی ہیں جن میں اہلِ ذوق کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہے:

شیخ شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ (حضرت شیخ محمد شناوی رحمہ اللہ تعالی) سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ میں جب بھی کسی فقیر کے پاس گیا ہوں تو اپنے آپ کو اس سے کمتر سمجھا ہے اور میں نے کبھی بھی طریق میں علاوہ سوال کے، لب کشائی نہیں کی، اور میں جب بھی کسی عالم یا فقیر کے پاس گیا ہوں تو کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل کر کے لوٹا ہوں لہذا جس کا یہ حال ہو اس کے مشائخ کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔

مزید لکھتے ہیں کہ (حضرت شیخ محمد شناویؒ) فرماتے تھے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے نبوت کے علاوہ کسی مقام کا دعوی کیا ہو اور میں نے اس کی تکذیب کی ہو۔ اس لیے کہ بہر حال وہ ایک ممکن چیز کا دعوی کر رہا ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ محمد شناویؒ سے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ ہم نے ان بلادِ غربیہ میں توحید کی آگ روشن کر دی ہے اور اب یہ قیامت تک نہیں بجھے گی ان شاء اللہ تعالی۔

آپ کے احوال نقل فرماتے ہوئے شیخ شعرانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ محمد شناویؒ کے شب و روز، ذکر اور قرآن کریم کی تلاوت میں گزرتے تھے۔ آپ عشاء سے کچھ دیر بعد فقراء کے ساتھ مجلس شروع فرماتے اور اس مجلس کا اختتام اکثر فجر کی نماز کے ساتھ ہوتا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد یہ مجالست چاشت تک رہتی تھی۔ پھر آپ عشاء تک تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے... ...

بلادِ غربیہ میں آپ کی وجہ سے منکرات و بدعات کا قلع قمع ہوا... ...

آپ جب کسی فقیر کو تلقینِ ذکر کی اجازت مرحمت فرماتے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر یہ شعر پڑھتے تھے:

أميم بليلى ما حييت فان أمت

أوكل بليلى من يهيم بها بعدى

ترجمہ:

میں جب تک زندہ ہوں، لیلی کی محبت میں گرفتار رہوں گا، اور جب مروں گا تو لیلی کو ایسے شخص کے سپرد کروں گا جو میرے بعد اس کی محبت میں گرفتار رہے

حضرت شیخ شعرانی ؒ مزید لکھتے ہیں کہ جب شیخ محمد شناویؒ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے بھی صوفیاء کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مختلف حضرات کو تلقینِ ذکر کی اجازت مرحمت فرمائی۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

حضرت شیخ عبدالرحمٰن مناوی، حضرت شیخ شہاب الدین سبکی، حضرت شیخ ابوالعباس حریثی، حضرت شیخ تاج الدین سقطی، شیخ عبدالقادر شنراوی اور فقیر عبدالوہاب شعراوی۔(۱)

قارئین کرام! ان ناموں کو ملاحظہ فرمائیں، ان میں سے ہر ہر شخصیت مکمل داستان ہے۔حضرت شیخ محمد شناویؒ کے خلفاء میں ایسے جلیل القدر اور نامور لوگوں کا آنا ہی آپ کے مقام ومرتبہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

شیخ محمد شناویؒ ،ہمارے ممدوح حضرت شیخ احمد شناویؒ کے پردادا ہیں۔اسی طرح شیخ احمد شناویؒ کے والد (شیخ علی بن عبدالقدوسؒ) اور دادا (شیخ عبدالقدوس بن محمدؒ) اپنے وقت کے صوفی بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔آپ کے والد ماجد کے تعارف کے ذیل میں حضرت شیخ عبدالحلیم چشتی ؒ فرماتے ہیں:

''موصوف اپنے زمانے کے مشہور محدث اور بلند پایہ صوفی تھے، شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ اور حافظ ابن حجر مکیؒ سے روایت کرتے ہیں۔''(۲)

اللہ رب العزت نے خاندانِ شناوی میں علم ومعرفت کے لحاظ سے کئی قدآور شخصیات پیدا فرمائی ہیں، علمِ حدیث سے اس خاندان کا والہانہ تعلق نظر آتا ہے۔احادیثِ مبارکہ کی کئی ایسی اسناد ملتی ہیں جن میں اس خاندان کے افراد نسل درنسل ایک دوسرے سے روایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

الفوائد الجليلة في مسلسلات ابن عقيلة کے مصنف محمد بن أحمد بن سعيد الحنفي المكيّ، شمس الدين، المعروف كوالده بعقيلة (ت ١١٥٠هـ) الْحَدِيثُ الْمُسَلْسَلُ بِتَلْقِينِ كَلِمَةِ لا إِلَهَ إِلا اللَّهُ کے ذیل میں سند یوں ذکر فرماتے ہیں:

... ... سَمِعْتُ ذَلِكَ مِنْ مَوْلانَا الْعَارِفِ بِاللَّهِ الصُّوفِيِّ السَّيِّدِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الأَحْمَدِيِّ، وَهُوَ سَمِعَ مِنَ الشَّيْخِ عِيسَى الشِّنَّاوِيِّ، وَهُوَ تَلَقَّنَ وَأَخَذَ عَنِ الشَّيْخِ أَحْمَدَ بْنِ عَلِيٍّ

---

(۱)ملخص من ''الطبقات الوسطیٰ'' رقم الترجمہ:۳۹۶ص:۸۸۷الی ۸۹۳

(۲)فوائد جامعہ ص:۴۳۸

الشِّنَّاوِيِّ، وَهُوَ أَخَذَ عَن وَالِدِهِ سَيِّدِي الشَّيْخِ عَلِيِّ الشِّنَّاوِيِّ، وَهُوَ أَخَذَ عَنْ وَالِدِهِ عَبْدِ الْقُدُّوسِ الشِّنَّاوِيِّ، وَهُوَ أَخَذَ عَنْ وَالِدِهِ قُطْبِ الأَقْطَابِ الشَّيْخِ مُحَمَّدٍ الشِّنَّاوِيِّ، وَهُوَ عَنْ وَالِدِهِ أَحْمَدَ الْبَطَلِ، الشَّهِيرِ بِالأَخْرَسِ، عَنْ وَالِدِهِ عَلِيٍّ... ...الی آخرہ (۱)

ترجمہ:

... ... میں نے یہ حدیث عارف باللہ صوفی مولانا سید محمد بن علی احمدی سے سنی، انہوں نے شیخ عیسی شناوی سے سنی، انہوں نے یہ حدیث شیخ احمد بن علی شناوی سے حاصل کی، انہوں نے اپنے والد سیدی شیخ علی شناوی سے حاصل کی، انہوں نے اپنے والد عبد القدوس شناوی سے حاصل کی، انہوں نے اپنے والد قطب الاقطاب شیخ محمد شناوی سے حاصل کی، انہوں نے اپنے والد احمد بطل المعروف بہ اخرس سے حاصل کی، انہوں نے اپنے والد علی سے حاصل کی... ...

اس سند کو ملاحظہ فرمائیں کہ اس میں کئی پشتوں تک بیٹا اپنے والد سے روایت کر رہا ہے۔ یہ اس خاندان کا امتیاز ہے کہ اس کی کئی پشتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک احادیث کی خدمت کے لیے منتخب ہوئی ہیں۔ اور کئی نسلیں سینہ بہ سینہ سلاسل طریقت سے جڑی ہیں۔

حضرت شیخ احمد شناویؒ اپنے بزرگوں کی طرح مسندِ حدیث پر بھی رونق افروز نظر آتے ہیں اور مسندِ طریقت پر بھی جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ سینکڑوں شخصیات ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں اور ہزارں سلسلے ہیں جن کی آپ لازمی کڑی ہیں۔

دکھائی دیتا ہے اِک بحرِ بیکراں وہ شخص:

خاندانِ شناوی میں علمِ حدیث اور علمِ تصوف نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ اس خاندان سے منسوب دسیوں شخصیات نے علوم و معارف کے معرکے سر کیے ہیں۔ اس خاندان میں دائیں بائیں کئی شاخیں نکلتی ہیں جن سے ہماری عظیم علمی تاریخ وابستہ ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ اس خاندان سے وابستہ شخصیات کے علمی کارنامے دنیا کے سامنے بیان کیے جائیں۔ کاش کہ اس کام کے لیے کسی آدمی کے دل میں تڑپ پیدا ہو۔

حضرت شیخ احمد شناویؒ کی خوش قسمتی تھی کہ جن چشموں کی جانب تشنگانِ علوم دیوانہ وار آتے تھے وہ آپ کو گھر کی دہلیز پر نصیب ہو رہے تھے۔ آپ کی تربیت اپنے والد کی آغوش میں ہوئی تھی۔ اور آپ نے اپنے والد سے

(۱) الفوائد الجليلة في مسلسلات ابن عقيلة ص:۸۶

خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا تھا۔

آپ فقہِ شافعی کے پیرو تھے۔آپ نے جن حضرات کے سامنے زانوے تلمذتہہ فرمایا تھا،ان میں کئی حضرات شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔کتبِ رجال میں آپ کے استاذ حضرت شیخ شمس رملیؒ کو شافعی صغیر کے نام سے یادکیا جاتا ہے۔اسی طرح دیگر کئی شخصیات سے آپ نے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل فرمائی تھی۔

حدیث کے باب میں آپ نے مختلف مشائخ سے استفادہ فرمایا تھا۔آپ نے مصر میں حضرت شیخ شمس رملی اور مدینہ منورہ میں سید صبغۃ بن روح اللہ سے خوب خوب استفادہ فرمایا تھا۔آپ کی صحیح بخاری کی سند تبرکاً پیشِ خدمت ہے:

أحمد بن علي بن عبد القدوس أبو المواهب الشناوي ، قال: أخبرنا الشيخ شمس الدين محمد بن أحمد بن محمد الرملي ، عن شيخ الإسلام أبي يحيى أحمد زكريا بن محمد الأنصاري، قال: قرأت على الشيخ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر الكناني العسقلاني صاحب فتح الباري ، عن الشيخ زين الدين ابراهيم بن احمد التنوخي ، عن ابى العباس احمد بن ابى طالب الحجار ، عن الشيخ سراج الدين الحسين بن المبارك الحنبلي الزبيدي ، عن الشيخ ابي الوقت عبد الأول بن عيسى بن شعيب السجزي الهروي ، عن الشيخ أبي الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفربن داود الداودي ، عن أبي محمد عبدالله بن أحمدالسرخسي ، عن أبي عبد محمد بن يوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربري ، وهو من أرشد تلامذة الإمام البخاري عن مؤلفه أمير المؤمنين في الحديث أبي عبدالله محمد بن اسماعيل بن ابراهيم بن بردزبة الجعفي البخاري رحمهم الله تعالى و نفعنا بعلومهم ، آمين [1] محمد أمين بن فضل الله بن محب الدين بن محمد المحبي الحموي الأصل، الدمشقي (ت ١١١١ھ) اپنی کتاب خلاصة الأثر فی قرن الحادی عشر میں آپ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

آپ نے مصر میں شمس رملی،قطب محمد بن ابوالحسن بکری اور نورزیادی سے اور مدینہ منورہ میں سید صبغۃ اللہ بن روح اللہ سندھی سے علم حاصل کیا تھا،آپ نے سید صبغۃ اللہ سے سلوک طے فرمایا،انہی سے خرقہ خلافت پہنا

([1])" ثبت العثمانی" سے ماخوذ

،انہی سے حقائق کے علوم حاصل کیے اور خلقت کے لیے تربیت وتلقین اور الباس وتحکیم میں اپنے ان شیخ کے قائم مقام ہو گئے۔

آپ کے مشائخ میں سید غضنفر بن جعفر بخاری مدنی بھی شامل ہیں۔(۱)

آپ کی شخصیت میں سب سے زیادہ رنگ بھرنے والی دو شخصیات ہیں۔ایک آپ کے استاذ حضرت شیخ شمس الدین محمد بن احمد رملی ہیں،جن سے آپ نے حدیث کے باب میں خوب استفادہ فرمایا تھا،اور دوسرے آپ کے سلسلہ طریقت کے شیخ سید صبغۃ اللہؒ ہیں،جن سے آپ نے حدیث بھی حاصل کی تھی اور خرقہ خلافت بھی پہنا تھا۔

آپ کے شیخ سید صبغۃ اللہ بن روح اللہ (المتوفی ۱۰۱۶ھ) سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے اولیاء کرام میں سے تھے۔سید صبغۃ اللہؒ مدینہ منورہ کے رہائشی تھے۔اور پانچوں نمازیں مسجد نبوی شریف میں پڑھا کرتے تھے۔آپ کے ہاتھ پر عجیب وغریب خوارق کا ظہور ہوتا تھا۔(۲)

سید صبغۃ اللہ بن روح اللہ نقشبندیؒ نے حضرت شیخ احمد شناویؒ کے قلب کو اجلا فرمایا،آپ کی شخصیت میں رنگ بھرے اور آپ کے لیے اس امانت کی حفاظت آسان فرمادی جو آپ کو اپنے بزرگوں سے ملی تھی۔

آپ کو مختلف مشائخ سے خرقے حاصل ہوئے تھے۔شیخ احمد قشاشیؒ (المتوفی ۱۰۷۱ھ) نے اپنی کتاب ''السمط المجيد في سلاسل أهل التوحيد'' میں مختلف اسنادِ طریقت ذکر فرمائی ہیں جو انہوں نے اپنے شیخ،حضرت احمد شناویؒ سے حاصل کی ہیں،شیخ قشاشیؒ کے نام کو چھوڑا جائے تو باقی سند آپ کی کہلائے گی۔اختصار کے ساتھ تبرکاً سلسلہ نقشبندیہ کی سند درج کی جاتی ہے:

... ...ابوالمواھب شیخ احمد بن علی شناویؒ نے خرقۂ خلافت حاصل کیا سید صبغۃ اللہ سے،انہوں نے وجیہ الدین علوی سے،انہوں نے سید محمد غوث سے،انہوں نے اپنے شیخ الحاج حصور سے،انہوں نے اپنے شیخ ہدیۃ اللہ سے،انہوں نے اپنے شیخ محمد علا المعروف قاضی شطاری سے،انہوں نے خواجہ عبید اللہ احرار سے،انہوں نے مولانا یعقوب چرخی سے،انہوں نے قطب العارفین خواجہ بہاء الدین محمد بن محمد بخاری نقشبندی سے **رحمهم الله تعالى عليهم اجمعين** (۳)

---

(۱)خلاصة الأثر في قرن الحادي عشر ج:۱ص:۲۴۳

(۲)ملخص من خلاصة الأثر في قرن الحادي عشر ج:۲ ص:۲۴۴

(۳) السمط المجيد في سلاسل أهل التوحيد ص : ۹۹

چراغ سے چراغ جلا، آپ کا فیض بھی چہار دانگ عالم میں پھیلا۔ حرمین شریفین میں آپ کی بڑی شہرت ہو چکی تھی۔ آپ نے مدینہ منورہ میں حلقہ درس قائم فرمایا تھا۔ آپ سے حدیث کے باب میں دسیوں مشاہیر مستفید ہوئے۔

آپ سے کثیر شخصیات نے استفادہ فرمایا تھا۔ ان شخصیات میں سید سالم بن احمد شیخان، صفی احمد بن محمد دجانی مدنی معروف بہ قشاشی سید جلیل محمد بن عمر حبشی غرابی اور دیگر کئی عارفین شامل ہیں۔ (۱)

آپ کے قلم سے کئی شاہکار کتب منظر عام پر آئیں۔ إسماعيل باشا البغدادي (المتوفیٰ ۱۳۹۹ھ) اپنی کتاب" هدية العارفين" میں آپ کی درج ذیل تصانیف ذکر فرماتے ہیں:

الارشاد إِلَى سَبِيل الرشاد ، افاضة الْجُود فِي وحدة الْوُجُود ، اقليد الفريد فِي جريد التَّوْحِيد ، بيعَة الاطلاق ، التأصيل وَالتَّفْصِيل ، تجلية البصائر حَاشِيَة على كتاب الْجَوَاهِر للغوث الْهِنْدِيّ ، خُلَاصَة الِاخْتِصَاص وَمَا للْكُلّ من الْخَواص ، ديوَان شعره ، السطعات الاحمدية فِي رَوَائِح مدائح الذَّات المحمدية ، سَعَة الاخلاق ، شِفَاء الغرام فِي اخبار الْكِرَام ، صادحة الازل وسانحة النزل ، الصُّحُف الناموسية والسحف الناووسية (ایک جلد میں) ، ضمائر السرائر الالهية فِي بواهر آيَات جَوَاهِر الغوثية (ایک بڑی جلد میں) ، فتح الاله فِيمَا يُقَال دبر كل صلاة ، فواتح الصَّلَوَات الاحمدية فِي لوائح مدائح الذَّات الاحمدية ، مناهج التأصيل ، مُوجبَات الرَّحْمَة وموثقات الْعِصْمَة (۲)

آپ شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتے تھے۔" معجم أعلام شعراء المدح النبوی" میں آپ کا نام نعت گو شعراء میں درج کیا گیا ہے۔ (۳)

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیے گا کہ شیخ احمد شناویؒ کس عظیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، پھر اس پر مستزاد یہ کہ خود بھی علوم و معارف کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحیح بخاری کی سند پڑھتے ہوئے جن شخصیات کے صرف ناموں پر اکتفاء کر لیا جاتا ہے وہ شخصیات اپنے آپ میں کتنی بڑی کائنات ہوتی ہیں۔

---

(۱) خلاصة الأثر فی قرن الحادی عشر ج:۱ص:۲۴۴

(۲) هدية العارفين ج:۱ص:۱۵۵

(۳) معجم أعلام شعراء المدح النبوی ص: ۷۳

حضرت شیخ احمد قشاشیؒ کا آپ سے تعلق:

شیخ احمد قشاشیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی سندِ حدیث کی تیسری کڑی ہیں، آپ نے علمِ حدیث حضرت شیخ احمد شناویؒ سے حاصل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ اگر حضرت شیخ احمد قشاشیؒ کی ملاقات شیخ احمد شناویؒ سے نہ ہوتی تو عین ممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، علمِ حدیث حجاز سے برصغیر منتقل نہ فرما سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے حضرت شیخ قشاشیؒ کو حضرت شیخ احمد شناویؒ کے قدموں میں بٹھایا، یہ رشتہ تلمذ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا رشتہ سلوک میں تبدیل ہوا، پھر یہ تعلق دونوں خاندانوں کے مابین رشتہ داری میں بدل گیا۔ شیخ احمد شناویؒ نے اپنے شاگرد شیخ احمد قشاشیؒ کو خرقہ خلافت بھی عطا فرمایا تھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح بھی آپ سے فرمایا تھا۔ اس نکاح سے شیخ احمد قشاشیؒ کے ہاں ایک صاحبزادی پیدا ہوتی ہے، پھر یہی صاحبزادی حضرت شیخ ابراہیم بن حسن کردیؒ کے نکاح میں آتی ہے۔ شیخ ابراہیم بن حسن کردیؒ، حضرت شیخ احمد قشاشی کے شاگرد بھی تھے اور خلیفہ مجاز بھی تھے۔ شیخ احمد قشاشیؒ نے ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے اپنی صاحبزادی ان کے نکاح میں دی تھی۔ شیخ احمد قشاشیؒ کی اس صاحبزادی کے بطن سے حضرت شیخ ابوطاہر کردی مدنیؒ کی پیدائش ہوتی ہے۔ شیخ ابوطاہر کردیؒ ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تربیت فرمائی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی اکثر احادیث کی اسناد حضرت شیخ ابوطاہر کردیؒ کے واسطے سے ہی اوپر کے مشائخ تک پہنچتی ہیں، نیز دسیوں سلاسلِ طریقت کے خرقے حضرت شاہ صاحب، حضرت شیخ ابوطاہر کردیؒ ہی سے حاصل فرماتے ہیں۔

اگر اس تمام سلسلے پر نظر کی جائے تو اولین سبب حضرت شیخ احمد قشاشیؒ اور شیخ احمد شناویؒ کا تعلق ہے جو روحانی اور نسبی ہر دو سلسلوں کے لیے بنیاد بنا ہے۔ یہی بنیاد کا پتھر ہے جس پر برصغیر کے عظیم علمی انقلاب کی تعمیر شروع ہوئی ہے۔ آج برصغیر پاک و ہند میں مختلف مسالک کا مرجع و منبع حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت ہے۔ باہمی اختلاف رائے کے باوجود ہر ایک کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے جا ملتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی صورت میں نمودار ہونے والے عظیم مرکز کی ساری نسبتیں حضرت شاہ صاحبؒ سے جڑتی ہیں۔ اس خطے میں دین کی جتنی خدمت ہو رہی ہے اس تمام کا ثواب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ذات کو پہنچتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی تمام خدمتیں حضرت شیخ ابوطاہر مدنیؒ کے حصے میں درج ہوتی ہیں اور شیخ ابوطاہر کردی مدنیؒ نسبی اور روحانی ہر دو لحاظ سے شیخ احمد قشاشیؒ اور شیخ احمد شناویؒ کی جانب منسوب ہیں۔ یقیناً اس خطے میں رونما ہونے والے عظیم انقلاب میں ان تمام ہستیوں کا پورا پورا حصہ ہے۔

ناموں میں مماثلت کے ساتھ ساتھ، شیخ احمد قشاشیؒ اور شیخ احمد شناویؒ دونوں شخصیات ہی مشہور اولیاء کرام کی

اولاد میں سے ہیں۔شیخ احمد قشاشیؒ فلسطین کے مشہور بزرگ شیخ احمد المقدسیؒ کی نسل میں سے ہیں۔شیخ احمد المقدسیؒ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے ہیں۔شیخ احمد شناویؒ، مصر کے مشہور بزرگ شیخ محمد شناویؒ کی اولاد میں سے ہیں۔استاد اور شاگرد دونوں ہی نسبی لحاظ سے بڑے بڑے اولیاء کرام کی جانب منسوب تھے۔قدرت نے ان دونوں بزرگوں کو قریب کرنے کے لیے راستے پیدا فرمائے۔اس ملاقات کا واقعہ بھی بہت عجیب ہے۔

ابو سالم العیاشی اپنی کتاب میں اس پورے واقعہ کو تفصیل سے نقل فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں شیخ قشاشیؒ نے خواب میں شیخ شناویؒ کی زیارت فرمائی، اس خواب کی تعبیر یہ نکالی کہ ان کا مقصود و مطلوب مدینہ منورہ میں شیخ شناویؒ کی صورت میں موجود ہے۔چنانچہ آپ مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔طلبِ صادق کا اثر تھا کہ جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کو سب سے پہلے ملنے والے ہی حضرت شیخ شناویؒ تھے۔شیخ شناویؒ نے آپ سے مصافحہ فرمایا اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر ارشاد فرمایا:

مرحبا بمن جاء يقتبس من علومنا (اس آدمی کو خوش آمدید جو ہمارے علوم حاصل کرے گا)

شیخ شناویؒ کو بھی القاء ہو چکا تھا کہ کوئی حق کا متلاشی آرہا ہے۔شیخ قشاشیؒ کو اپنے خواب کے سچا ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔آپ نے شیخ شناویؒ کی صحبت کو لازم پکڑ لیا اور برابر ترقی کے درجات طے فرماتے رہے۔یہاں تک کہ آپ اپنے شیخ کے خاص اصحاب میں شمار ہوئے، ان کی جگر گوشہ طاہرہ شہزادی سے نکاح کی سعادت حاصل کی اور ان کے خلیفہ نامزد ہوئے... ...

حضرت شیخ قشاشیؒ اگرچہ کثیر مشائخ سے استفادہ فرما چکے تھے لیکن اپنے آپ کو صرف حضرت شیخ شناویؒ کی جانب منسوب کیا کرتے تھے، اس لیے کہ انہی کے ہاتھ پر وہ مرتبہِ کمال کو پہنچے تھے۔(۱)

حضرت شیخ قشاشیؒ کے بزرگوں کا طریق میں سلسلہ قادریہ تھا اور فروع میں مذہب مالکیہ تھا۔آپ اپنے بزرگوں کے طریق پر چلتے اور ان کے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے پروان چڑھے تھے۔یہاں تک کہ آپ کا تعلق شیخ شناویؒ سے قائم ہوا۔ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔پھر جیسا کہ مریدِ صادق کی شان ہے کہ وہ شیخ حاذق کا مذہب فروع میں بھی اختیار کرتا ہے، شیخ کے ساتھ محبت، شیخ کی انتہائی درجے کی اتباع اور اپنے تمام معاملات میں شیخ کی اقتداء نے آپ سے بھی تقاضا کیا کہ آپ فروع میں بھی شیخ کا مذہب اختیار کرلیں۔حضرت شیخ شناویؒ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔شیخ قشاشیؒ فرمایا کرتے تھے: تشفعت بالشيخ ، یہ انتہائی بلیغ جملہ ہے، اس سے اللہ کے

---

(۱) ملخص من الرحلة العياشية ج:۱ص:۵۸۷،۵۸۸

ہاں شفاعت کرنے کا معنی بھی نکلتا ہے، اس لیے کہ شیخ مرید کے لیے شفیع ہے، اور شیخ کی وجہ سے شافعی ہونے کا معنی بھی نکلتا ہے۔ اور دونوں معانی اپنی جگہ درست ہیں۔ شیخ قشاشیؒ نے اولاً فقہ مالکی کی چند کتب پڑھی تھیں، جب آپ شافعی مذہب کی طرف منتقل ہوئے تو شوافع کی کتب پڑھیں، پھر آپ دونوں مذاہب میں فتوی دیا کرتے تھے۔ (۱)

شیخ قشاشیؒ، شیخ شناویؒ سے حدیث کے باب میں بھی خوب مستفید ہوئے تھے اور طریقت کے باب میں بھی اپنے آپ کو ہمیشہ شیخ شناویؒ کی جانب منسوب کرتے تھے حالانکہ آپ کے مشائخ کی تعداد سو (۱۰۰) سے زائد تھی۔

سفر آخرت: احادیث مبارکہ کی لازوال خدمت کرنے والے اس عظیم کارواں کے ساتھ قدرت کی فیاضی بھی غیر معمولی رہی ہے۔ نسبی سلسلوں میں یہ تمام نام اکٹھے نظر آتے ہیں، روحانی سلسلوں میں ان کے نام یکجا دکھائی دیتے ہیں، حدیث، فقہ، تصوف ہر میدان میں یہ نام ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔ سب کی زندگی مدینہ منورہ میں بسر ہوتی ہے، سب کی وفات مدینہ منورہ میں ہوتی ہے اور یہ کارواں، زندگی کی منازل طے کرتا ہوا بقیعِ پاک میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔

مجھ کو نہیں قبول دو عالم کی وسعتیں
قسمت میں کوئے یار کی دو گز زمیں رہے

شیخ احمد شناویؒ کے شیخ سید صبغۃ اللہ بن روح اللہؒ مدینہ منورہ میں زندگی گزارتے ہیں، ۱۰۱۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پاتے ہیں اور تدفین جنت البقیع میں ہوتی ہے۔ (۲)

ان کے شاگرد اور خلیفہ مجاز، شیخ احمد شناویؒ کی وفات ۸ ذوالحجہ ۱۰۲۱ھ کو مدینہ منورہ میں ہوتی ہے اور تدفین جنت البقیع میں اپنے شیخ کے پہلو میں ہوتی ہے۔ (۳)

شیخ احمد شناویؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز شیخ احمد قشاشیؒ کی وفات ۱۰۷۱ھ کو مدینہ منورہ میں ہوتی ہے اور تدفین جنت البقیع میں اماں حلیمہ سعدیہ کے مزار کے مشرقی گوشے میں ہوتی ہے۔ (۴)

شیخ احمد قشاشیؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز شیخ ابراہیم بن حسن کردیؒ کی وفات ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۰۱ھ کو مدینہ منورہ

---

(۱) الرحلة العياشية ج:۱ص:۵۸۱

(۲) سمط النجوم العوالی فی أنباء الأوائل والتوالی ج:۴ص:۴۰۲

(۳) خلاصة الأثر فی قرن الحادی عشر ج:۱ص:۲۴۳

(۴) مشيخة ابو المواهب الحنبلی ص:۹۵

میں ہوتی ہے اور تدفین جنت البقیع میں ہوتی ہے۔(۱)

شیخ ابراہیم بن حسنؒ کے صاحبزادے، شاگرد اور خلیفہ مجاز شیخ ابو طاہر کردی مدنی ؒ کی وفات ۴ رمضان المبارک ۱۱۴۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوتی ہے اور تدفین جنت البقیع میں ہوتی ہے۔(۲)

وہ کاروانِ عشق، جس کا سفر احادیث کے حلقوں سے شروع ہوتا ہے، وہ بارگاہ رسالت سے فیضیاب ہوتا ہوا بقیع پاک کی چھاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ المرء مع من احب کے الفاظ گواہی دے رہے ہیں کہ مآلِ کار جنت میں بھی اس کارواں کے مسافر یکجا دکھائی دیں گے ان شاء اللہ تعالی۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

ترجمہ:

سعدی کی آنکھیں اور دل تیرے ہمراہ ہے تا کہ تُو یہ نہ سمجھے کہ تُو تنہا جا رہا ہے

اللہ رب العزت ان تمام بزرگوں کی قبور کو ٹھنڈا فرمائے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمارے اکابرین نے ہمیشہ سادگی اور تصنع وتکلف سے عاری زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ علم کے میدان میں بہت مشقتیں برداشت کیں، صاحب مصابیح امام بغوی ابومحمد الحسین ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ بہت زاہد اور متقی تھے، فقط خشک روٹی کھایا کرتے تھے، حتیٰ کہ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اپنے آپ کو بڑا زاہد اور متقی ظاہر کرتے ہیں، اس پر انہوں نے تیل کے ساتھ روٹی کھانا شروع کر دی۔ لیکن افسوس کہ اب علمیت پر مادیت غالب آ گئی اور کردار سازی کا عمل کمزور پڑ گیا۔ خلوص، للّٰہیت اور سادگی وہ صفات ہیں جو کہ حصول تعلیم کے لئے بھی مددگار ہیں اور اخلاق وکردار کے اعلیٰ مقام پر بھی فائز کر دیتی ہیں۔ معلم اپنے طلبہ کو زہد وتقویٰ اور اخلاص کا وہ نمونہ پیش کرے کہ جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اچھے شہری بنیں اور مسلم معاشرے کی صحیح نمائندگی کر سکیں۔ چنانچہ موجودہ تعلیمی انحطاط اور اخلاقی پستی کے تدارک کے لئے ہمیں انفرادی واجتماعی طور پر اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور آج کے معلم کو بھی پوری دیانتداری اور فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ رہنا ہوگا اور ان اوصاف وخصوصیات کے ساتھ اپنے آپ کو مزین کرنا ہوگا جن کا ذکر اس مضمون کر دیا گیا ہے، اللہ جل شانہ ہمارے اساتذہ اور معلمین کو ان اوصاف کے ساتھ متصف فرمائے اور ان کی محنتوں اور تعلیمی وتربیتی مساعی کو بارآور بنائے، آمین!

---

(۱)سلک الدرر ج:۱ص:۱۰

(۲)فہرس الفہارس ج:۱ص:۴۹۵

''معتد بہ کلامِ مقدّس'' نامی کتاب؛ایک جائزہ

مولانا مفتی سمیع الرحمٰن

یہ کتاب اٹھارہ مسیحی محقق علماء کے مقالہ جات کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالے دس سال کے عرصے میں مختلف مقامات اور متفرق اوقات میں منعقد ہونے والے عالمی سیمیناروں میں لیکچر کی صورت میں پیش کئے گئے۔تمام مقالہ نگار مسیحی دنیا میں چوٹی کے محقق علما شمار ہوتے ہیں۔ان میں سے سولہ علماء علم الٰہیات میں پی ایچ ڈی ڈگری کے حاصل ہیں اور ایک صاحب بشپ بھی ہیں۔ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جیسے کم علم یا مذہب بیزار کہا جا سکے بلکہ ہر ایک راسخ العقیدہ مسیحی ہے اور اپنی پوری زندگی میں یسوع مسیح کے پیغام کو انسانیت،تک پہنچانے کی اعلی خدمات انجام دیتا رہا،ان سب کا تعارف کتاب کے ابتدائیہ میں موجود ہے۔مختصر یہ کہ ان کے پرخلوص مسیحی ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کا موضوع: بائبل مقدس کے متن میں تراجم کے اصول وقواعد کے کو بیان کرنا ہے۔مسیحی علماء نے دوران تحقیق جذبات کو ایک دائرے میں رکھ کر تحریف بائبل کا کھلے دلوں اعتراف کیا ہے۔متحدہ بائل سوسائیٹیز نے 1998ء میں پہلی بار ہسپانوی زبان میں اس کو DESCUBRELA BIBLIA کے عنوان سے شائع کیا۔ بعدازاں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم وجود میں آئے۔متحدہ بائبل سوسائٹیز ہی نے اہتمام سے اس کا اردو ترجمہ کرایا،جس کی تقریب رونمائی پاکستان بائبل سوسائٹی کی ایک سو پچاس سالہ خدمات کی تقریبات کے اختتام پر 16 نومبر 2013ء بروز ہفتہ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل دی مال لاہور میں عشائیہ کے موقع پر کی گئی۔

برصغیر کے مسیحی طبقے کی پریشانی:

پاک وہند میں ڈیڑھ صدی تک مسیحی محققین عصمت بائبل کا راگ الاپتے رہے۔ڈاکٹر حشمت اللہ پادری آنجہانی نے 1927ء میں اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''براہین نیّرہ در باب صحت واصلیت بائبل وابطال دعوی تحریف بائبل'' کے نام سے کتاب لکھی۔1929ء میں علامہ ڈبلیو میسیچن ایم اے آنجہانی نے ''تعریف انجیل وصحت انجیل'' کے نام سے رسالہ لکھا۔معروف مسیحی محقق علامہ برکت اللہ آنجہانی نے 1959ء میں ''قدامت واصلیت اناجیل اربعہ'' کے نام سے اور 1969ء میں ''صحت کتب مقدسہ'' کے نام سے رسالہ لکھا ۔مسیحی علماء کا یہ ایک دعوی نہیں تھا بلکہ ایک کذبِ مسلسل تھا جسے تحقیق کا نام دے کر سادہ لوح مسیحی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی رہی۔قدرت نے اس

کذبِ مسلسل کا اور خودساختہ تقدس کی سزا کسی حریف سے نہیں بلکہ خود انہیں کے گھر سے دلوائی۔ چنانچہ جب یہ کتاب بائبل سوسائٹی نے اپنی سرپرستی میں شائع کرائی تو مسیحی پادریوں کے ڈیڑھ سو سالہ دعوے لمحہ بھر میں زمین بوس ہو گئے جو ہمیشہ سرِ آسمان رہتے تھے۔ اس کتاب میں جھوٹ کے چہرے پر سچائی کا ایسا تھپڑ رسید کیا ہے کہ اس کی گونج آج ہر طرف سنائی دیتی ہے۔ سچائی جب اپنا راستہ بناتی ہے تو وہ باطل کے گھر کے چراغ سے ہی سے باطل کا گھر جلانے کا سامان کر دیتی ہے۔ اس کتاب نے خاموشی سے وہ سب کہہ دیا جو برسوں کے خطبوں میں نہ کہا جا سکا۔ ہر دعوی خواہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو ایک دن دلیل کے کٹہرے میں ضرور کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسیحی پادری جو پہلے اس تحقیقی کتاب کی اشاعت پر اظہار مسرت کر رہے تھے، ان کا لہجہ یک لخت اس وقت بدل گیا جب مسلمان علماء کرام نے اسی کتاب سے ان کو آئینہ دکھانا شروع کیا، تب مسیحی علماء اس کتاب کی اشاعت اور اس کے مضر اثرات کا اندازہ ہوا، چنانچہ اپنی جھوٹی ندامت چھپانے کے لیے اپنی ہی بائبل سوسائٹی کے خلاف احتجاج پر اتر آئے۔ کسی نے پاکستان بائبل سوسائٹی کو خائن کہا۔ کسی نے اسے مسلمانوں کی سازش قرار دیکر دل کو جھوٹی تسلی اور کسی نے پاکستان بائبل سوسائٹی سے متنازعہ صفحات ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ الغرض کسی کو یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں ہوئی کہ اس کتاب کا علمی جواب دیا جائے اور اپنے مسیحی محققین کو ہی جواب دہ ٹھہرایا جائے، برصغیر کے مسیحی علماء کے غیر علمی اور جذباتی اور احتجاجی رویہ کی بنا پر اردو ترجمہ کی اشاعت روک دی گئی۔ لیکن کیا کتاب کی اشاعت رک جانے سے تحقیقی سوال کا سلسلہ رک جائے گا؟ فرانسیسی اور انگریزی نسخے طبع ہو رہے ہیں۔ کیا اس کے خلاف بھی کبھی احتجاج ہوگا؟ کتاب میں مسیحی اہل علم کی طرف سے جو تحقیقی سوال قائم کیے گئے ہیں، کیا برصغیر کے مسیحی اہل علم اس کا علمی جواب دینے کی کوشش کریں گے؟ یہ سارے وہ سوالات ہیں جو سنجیدہ قارئین کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں مگر انہیں جواب نہیں ملتا۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر تحریف اناجیل کے اقرار نامے کہ چند نمونے آپ کی خدمت میں پیش کیئے جاتے ہیں پڑھیئے اور لطف اٹھایئے۔ اگر چہ دو درجن کے قریب اسی طرح کے اقرار نامے صریح الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔

1۔ ''یشوع کی زبان'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

''یہ بات اس لیے بھی بہت دلچسپی کی حامل ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس یسوع مسیح کے بالکل صحیح الفاظ کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ ہمارے پاس اس کے الفاظ صرف یونانی ترجمے میں موجود ہیں۔ بالکل شروع ہی سے مسیحیت وہ مذہب رہا ہے جس نے اپنے پاک نوشتے ایمانداروں کو دینے کے لیے ترجمہ استعمال کیا ہے۔ جو مسیحی آج کل ترجمے کے کام میں مصروف ہیں وہ فقط اناجیل کے پہلے مصنفین کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔'' (معتدبہ

کلام مقدس:۱۱۸)

(2) کتاب میں ''متنی تنقید کا مقصد'' کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔

''نئے عہد نامہ کی متنی تنقید بائبل کے متون اور قدیم قلمی نسخوں کا مطالعہ اور تحقیق ہے۔اس مطالعے کا اولین مقصد اصل تحریروں جنہیں "اصل مسودات" یا "خودنوشت مسودات" کہتے ہیں کے صحیح صحیح متن کا تعین کرنا ہے۔یعنی وہ متن جو نئے عہد نامہ کی ہاتھ سے لکھی ہوئی نقول تیار کرنے والے کاتبوں کی تبدیلیاں اور غلطیاں کرنے سے پہلے تھا۔خوب سمجھ لیں اور یاد رکھیں کہ مندرجہ ذیل پیرا نئے عہد نامہ کے الہامی ہونے پر بات نہیں کر رہا اور نہ اس سوال پر کہ اصل تحریروں میں غلطیاں تھیں یا نہیں۔اصلی قلمی نسخے تو موجود ہی نہیں۔ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ نقول کی نقول ہیں۔ان مسائل پر بہت بحث ہوتی آئی ہے اصل تحریروں کے متن کا تعین کرنا ممکن ہے یا نہیں، اور کیا متنی تنقید کا یہ اولین مقصد ہونا چاہیے یا نہیں؟ دوسرے علما کے مطابق یہ پاپائرس نسخے پاپائرس نسخے ان قدیم تحریروں کو کہا جاتا ہے جو پاپائرس نامی پودے سے بنے کاغذ پر لکھی گئی ہوں اور عموماً یہ ابتدائی مسیحی متون، خاص طور پر انجیل کے سب سے پرانے نسخے سمجھے جاتے ہیں۔ہمیں ماضی میں متن کی صرف اس ہیئت تک پہنچاتے ہیں جو تیسری صدی میں موجود تھی اور ضروری نہیں کہ یہ متن کی اصلی ہیئتیں ہوں جو نسخوں میں غلطیاں اور تبدیلیاں ہونے سے پہلے تھیں۔'' (معتدبہ کلام مقدس:ص:۱۲۰)

(3) کتاب میں ''متنی تنقید کا مقصد'' کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ سہواً غلطی کرنے کے علاوہ بعض اوقات ارادتاً تبدیلیاں بھی کر دیتے تھے۔صرف رفتہ رفتہ ہی کہیں دوسری صدی میں ان مسیحی ان تحریروں کو پاک نوشتے سمجھنے لگے، یعنی کسی مفہوم میں عبرانی نوشتوں کے ہم پلہ جو کلیسا کو یہودیت سے ملے تھے۔" (معتدبہ کلام مقدس:(۱۲۱)

(4) کتاب میں ''متنی تنقید کا مقصد'' کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔

''ان نسخوں کی نقلیں صدیوں سے تیار ہوتی آ رہی ہیں۔اس عرصے کے دوران یہ غلطیاں اور تبدیلیاں کیسے در آئیں؟ اس سوال کے جواب سے متنی نقادوں کو مدد ملتی ہے کہ وہ معیار اور اصول قائم کریں جن کے مطابق وہ ممکنہ حد تک اصلی متن تک پہنچ سکیں۔دانستہ یا ارادی تصرفات (تبدیلیاں) نئے عہد نامہ کی تحریروں کی نقلیں تیار کرتے ہوئے نقل نویس بعض اوقات متن میں تصرفات کر دیتے تھے۔بعض تصرفات دانستہ یا ارادی ہوتے تھے تا کہ اسلوب بیان بہتر ہو جائے یا زبان قواعد گرامر کے مطابق ہو جائے۔دوسرے دانستہ تصرفات اس لئے کئے گئے کہ ایک انجیل کے متن کو دوسری انجیل کے متن کے مطابق یا پولس کے ایک خط کے مندرجات کو اُس کے کسی دوسرے خط

کے مندرجات کے مطابق بنا دیا جائے۔'' معتد بہ کلام مقدس:ص:(۱۲۴)

(5)اسی عنوان میں آگے مذکور ہے۔

''اور آج بہت سے علماء اسے وہ نوع سمجھتے ہیں جو اصل تحریروں کے متن کے قریب ترین ہے۔جن نسخوں میں یہ نوع ہے وہ بہترین نسخے مانے جاتے ہیں، حالانکہ یہ نسخے بھی ہر ایک آیت میں ایک دوسرے سے مماثل نہیں اور ان سب میں غلطیاں بھی ہیں۔'' (معتد بہ کلام مقدس:ص:(۱۲۷)

(6) کتاب کے عنوان ''متن کسی طرح آگے منتقل ہوا'' کے ذیل میں مذکور ہے۔

'' لکھتے وقت اُن کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اُسے وہ معتبری اور سند حاصل ہے یا کبھی حاصل ہو جائے گی جو اُن مقدس متون کو حاصل ہے جو یہودی عبادت خانوں اور ابتدائی مسیحیوں کے اجتماعات یا عبادتوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ سوائے ''مکاشفہ'' کے نئے عہد نامے میں کہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے کہ مصنفین کو یقین تھا کہ جو ہم لکھ رہے ہیں وہ ''مقدس صحائف'' کا حصہ بن جائے گا۔'' (معتقد بہ کلام مقدس:ص:(165)

(7) کتاب کے عنوان '' نئے عہد نامے کی تمام تحریروں میں درپیش مشترک مشکلات'' کے ضمن میں ہے۔

''مترجمین کو درپیش پہلا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے یونانی متن سے ترجمہ کریں؟ ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل متون میں سے کوئی بھی باقی نہیں ہے، صرف اصل نسخوں کی نقول کی نقول موجود ہیں۔شروع صدیوں میں جب نسخوں کو نقول سے ہاتھ کی لکھی ہوئی نقول تیار کی گئیں تو نقل کرنے والوں سے کئی غلطیاں ہوئیں۔اسی وجہ سے، گو ہمارے پاس آج نئے عہد نامے کی یونانی، لاطینی، سریانی، قبطی اور دیگر قدیم زبانوں میں ہزاروں نقول موجود ہیں، مگر ان میں غلطیاں موجود ہیں۔متن کے ماہرین کے لئے مشکل یہ ہے کہ جب ہم ان نسخوں کا آپس موازنہ کرتے ہیں اور فرق دیکھتے ہیں تو کیسے جان سکتے ہیں کہ کون سے الفاظ میں اصلی ہیں اور کون سے نقول کرنے والوں کی غلطیاں ہیں؟ سولہویں صدی عیسوی سے لے کر اب تک یونانی نئے عہد نامے کی کئی مطبوعہ اشاعتیں شائع ہو چکی ہیں۔ان مطبوعہ اشاعتوں کے مدیر صرف کسی ایک یونانی نسخے سے استفادہ نہیں کرتے۔زیادہ تر متن کے لئے وہ ایسے نسخوں سے استفادہ کرتے ہیں جنہیں وہ بہترین سمجھتے ہیں، لیکن اگر وہ سمجھیں کہ ان بہترین نسخوں میں بھی غلطیاں ہیں تو وہ دیگر نسخوں کے منتخب حصوں کو استعمال کرتے ہیں'' معتد بہ کلام مقدس:ص: (331)

یہ اقرار نامے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر نقل کیے گئے ہیں۔مسیحیت کے رد و نقد پر کام کرنے والے اہل علم کے لیے اس کتاب میں وافر علمی مواد اور قابل قدر استدلالی سرمایہ موجود ہے۔

مطالعے کی میز سے

محمد احمد حافظ

تعلیم کی اہمیت:

تعلیم کی اہمیت بہت بڑی ہے، یہی وہ سانچہ ہے جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشوونما، دماغی استعداد اور قلبی قوت یقینی یعنی ساری ذہنیت اسی کے ذریعے بنائی اور بگاڑی جاسکتی ہے، امت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے وہ اس کے ذریعے تیار ہوتے ہیں اور ہوسکت ہیں۔ (مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ۔ شذرات سلیمانی)

شرح صدر کے لیے دعا:

میرے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم سبق پڑھانے جاؤ تو راستے میں دعا مانگتے ہوئے جاؤ کہ یا اللہ! پڑھانے جارہا ہوں، شرحِ صدر کے ساتھ پڑھانے کی توفیق عطا فرمایئے، طلبا کو اس سے فائدہ پہنچایئے اور اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیجیے۔ جتنا جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا، اتنا ہی اس کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا، اتنا ہی طلبا کو فائدہ ہوگا۔ (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم۔ رموزِ تدریس وتربیت:110)

گھروں میں تعلیم کا اہتمام:

تعلیم کی اہمیت تو ہر مقام پر واضح ہے۔ مدرسہ ہو، اسکول ہو، مکاتب ہوں، جگہ، لیکن گھروں میں بھی تعلیم کا اہتمام ہو۔ اس حوالے سے ہمارے ہاں تساہل پایا جاتا ہے۔ گھروں میں خصوصا علماء کے گھرانوں میں تو تعلیم کا ضرور اہتمام ہونا چاہیے۔ کوئی بھی وقت مقرر کرکے کم از کم پندرہ منٹ کی تعلیم ہو۔ اس میں سب افرادِ خانہ موجود ہو۔ مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مرض وفات میں اس بات کا شدید داعیہ تھا کہ گھر میں بچوں کے لیے تعلیم کا حلقہ لگایا، اس میں مناسب حال کوئی نہ کوئی کتاب پڑھو۔ چاہے وہ کتاب ''فہم دین کورس'' ہو۔ ''فضائل اعمال'' ہو یا کوئی اور کتاب ہو۔ جس سے بچوں میں دین کا شوق اور جذبہ بیدار ہو۔ اور اس کا خوب اہتمام کرو۔ (بحوالہ اشاعت خاص ماہنامہ دارالتقویٰ)

نجات کے لیے عمل شرط ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'' نازل ہوئی

(یعنی اپنے قریب والے خاندان کو (عذاب الٰہی سے) ڈراؤ!.

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو پکارا (اور جمع کیا) اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) کو فرمایا:

''اے فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، کیونکہ میں تم کو اللہ تعالیٰ سے بچانے کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔''

(روایت کیا اس کو مسلم نے، مشکوٰۃ)

ف: بعضوں کو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں یا فلاں خاندان میں بیعت ہیں اور اس بنا پر اصلاحِ عقائد و اعمال سے بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اس دعوے اور ناز کی اس حدیث سے جڑ کٹتی ہے۔ (التکشف، ص: 428) (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) (بحوالہ بصائر حکیم الامت)

اپنی اصلاح کی تڑپ:

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد نور اللہ مرقدہ معمولی شخصیت نہ تھے۔ ان کے رسوخ فی العلم اور تقویٰ و دیانت کا زمانہ معترف ہے۔ اس کے باوجود انہیں برابر اپنی اصلاح کی فکر رہتی تھی۔ اپنے شاگردوں کو بھی تاکید فرماتے تھے کہ:

''میرے اندر کوئی علمی غلطی، یا کوئی عملی کوتاہی نظر آئے تو بتایا کریں، یہاں تک کہ عام بول چال اور گفتگو میں بھی تلفظ کی کوئی غلطی سنیں یا تحریر میں؛ رسم الخط کی کوئی غلطی دیکھیں تو وہ بھی لازماً بتایا کریں۔ اسی طرح میرے اقوال، اعمال، اور احوال کی طرف بھی خاص توجہ رکھا کریں، کوئی بات ذرا سی بھی کھٹکے تو بتانے میں غفلت ہرگز نہ کریں۔ اگر زبانی بتانے میں جھجک محسوس کریں تو لکھ کر دے دیا کریں۔

ایک مرتبہ طلبہ کو بھی اپنے اندر اصلاح علم و عمل کی ایسی طلب پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''قرآن، حدیث اور عقل و تجربہ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ اصلاح کے لیے باہم گفت و شنید اور کہنے سننے کا سلسلہ رکھنا بہت ضروری ہے۔'' (انوار الرشید ص: ۲۵۴، جلد اول)

سید احمد شہید کی تحریکِ اصلاح:

امیر المومنین حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت نے مسلمانوں کو عہد صحابہ کی یاد دلا دی، جہاد سے قبل اس جماعت نے ایک ملک گیر دورہ کیا جس میں شمالی ہند کے دورے کی خاص طور پر تفصیلات ملتی ہیں۔ اس دورے میں جہاں یہ حضرات لوگوں کو اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد پر آمادہ کر رہے تھے، وہیں ان کو اسلام کی سیدھی سادی

زندگی اور کتاب وسنت کے اتباع کی تبلیغ کا فریضہ بھی ادا کرتے جاتے۔

بدعت، شرک، تعزیہ پرستی، پیر پرستی، اور تمام غیر اسلامی رسوم و بدعات کا قلع قمع کرتے تھے۔لوگ جوق در جوق ان کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوتے تھے۔اور کتاب وسنت کے راستے کو اختیار کرتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ جن کے پیش نظر اعلاءِ کلمۃ اللہ ہوتا ہے اور جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی کے ان واقعات سے شیفتگی ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں کس طرح تبلیغ فرمائی ہے؟ وہ باطل سے نہیں ڈرتے اور وہ اس دشوار گزار راستے کو اختیار کرتے ہیں۔(مجلہ ''یادگار اکابر'' سے ایک اقتباس)

القاب کا غیر ضروری استعمال:

حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''ایک عالم دین کی فضیلت عام آدمی پر بہت زیادہ ہے، لیکن ایک متوسط اور محقق جید عالم کے درمیان حفظ مراتب کا ہونا ضروری ہے، ہر ایک کو فقیہہ العصر، متکلم اسلام، جامع المنقول والمعقول لکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر کچی اور پکی اینٹوں کو ایک دام خریدنا شروع کیا جائے تو لوگ لازم پکی اینٹیں بنانا چھوڑ دینگے، کیونکہ دام ایک ہی ہے، اگرچہ ایک عالم دین کو سب کچھ رضائے الٰہی کے لئے کرنا چاہیے، نہ کہ مرتبہ اونچا بنانے کی خاطر، لیکن ہمیں بھی اُن کے علمی مرتبے کا خیال رکھنا چاہیے۔اگر ہم نے جید علماء کی قدردانی میں کوتاہی سے کام لیا، تو علوم دینیہ میں مہارت کی طرف دھیان کم ہوجائیگا'' (نقوش افغانی، ص: ۲۴)

داعیانہ مزاج:

داعیانہ مزاج کیا ہوتا ہے؟ دعوت کا کام کوئی فلسفہ نہیں، یہ تو ایک تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے، ایک محبت بھری نگاہ کا کرشمہ ہے۔۔۔۔۔۔بشرطیکہ ہمارے دل میں خیر خواہی آجائے، ہمارے دل میں آخرت کی اہمیت ہو، جنت اور جہنم کا یقین ہمارے دلوں میں پیوست ہو۔کیسے برداشت ہو کہ میرا پڑوسی ایک اچھا انسان تو ہے، اچھا ڈاکٹر اور انجنیئر ہے بہت پیارا انسان ہے کیا یہ جہنم میں جائے گا؟ کیسے؟ اس کی ہدایت کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے، کچھ نہیں کرسکتے تو اس کی ہدایت کے لیے اللہ کے سامنے رو تو سکتے ہیں!۔(حضرت مولانا سجاد نعمانی حفظہ اللہ سے مستعار)